حضرت امیر خسرو　فخر الدین علی احمد　ڈپٹی نذیر احمد　نواب محسن الملک　نواب عماد الملک

شمس العلما نواب عزیز جنگ ولا

انجمن

مولوی غلام محمد　پروفیسر ہارون خاں شیروانی　ڈاکٹر سید عبد اللطیف　محمد عبد اللہ جابر　نواب دین یار جنگ

راگھویندر راؤ جذب عالمپوری

علی موسیٰ رضا مہاجر

میر ولایت علی

میر اکبر علی خاں

پروفیسر آر گامو

دامودر ذکی ٹھاکر

پروفیسر عبد المجید خاں

حسن الدین احمد

جان بارتھ وک گل کرسٹ

خواجہ فیاض الدین

عابد علی خاں

عزیز احمد وارثی

رحیم بالا

سلسلہ مطبوعات ولا اکیڈیمی (۲۶)

حسن الدین احمد

اپنے دونوں بیٹوں

اور

تمام نوجوان نسل کے نام

جن کے لئے میں نے یہ انجمن سجائی ہے

زمانہ اشاعت	ستمبر ۱۹۷۴ء
تعداد اشاعت	۱۰۰۰
کتابت	عبدالغفور خاں
طباعت	کوہ نور پریس دہلی
ناشر	ولا اکیڈیمی حیدرآباد
قیمت	پندرہ روپے

ملنے کا پتہ ولا اکیڈیمی عزیز باغ سلطان پورہ حیدرآباد ۲۴ اے پی

ترتیب

مضامین	صفحہ

ابتدائی باتیں

"اردو الفاظ شماری" کے سلسلہ میں "نمائندہ ادب" کا انتخاب کرتے ہوئے مجھے اردو ادب کے وسیع پیمانہ پر سروے کا نادر موقع ملا۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ اردو نثر کا قابل لحاظ حصّہ سوانح نگاری پر مشتمل ہے جو زیادہ تر تذکروں، مذہبی ادب (سیرت، تذکرہ بزرگان دین اولیاء وغیرہ) اور مستقل سوانح نگاری کی شکل میں ہے۔ اردو کے مایہ ناز نثر نگاروں سرسید۔ حالی، شبلی۔ نذیر احمد عبدالحلیم شرر، مولانا آزاد، خواجہ حسن نظامی نے کسی نہ کسی حیثیت سے سوانح نگاری کی لیکن جہاں تک سوانح مضامین کے مجموعوں کا تعلق ہے اردو میں بہت کم کام ہوا ہے۔ جو مجموعے شائع ہوئے ہیں اُن کو انگلیوں پر گنا جاسکتا ہے۔ سرسید احمد خاں کی تصنیف "آثار الصنادید" (چوتھا باب سوانحی مضامین کے مجموعہ پر مشتمل ہے) نواب عزیز جنگ ولاؔ کی تاریخ النوائط (ایک حصہ مشاہیر قوم کے سوانحی حالات کا مجموعہ ہے) شرر کے سوانحی مضامین کے مجموعے "گنج ہائے گراں مایہ" از رشید احمد صدیقی۔ چیدہ شخصیتیں از ابوالکلام آزاد "چند ہم عصر" از مولوی عبدالحق کو ان میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ ادھر چند سال میں البتہ اس کمی کو پورا کرنے کی کوششیں ہوتی ہیں۔ پھر بھی میں نے یہ محسوس کیا کہ اردو میں ابھی اس صنف کو ترقی کے منازل طے کرنا ہے۔ اور اس میدان میں کافی تجربے کرنا ہے۔ یہ بات بھی پیش نظر رہی کہ سوانح نگاری کوئی آسان کام نہیں۔ جیسا کہ "اردو میں سوانح نگاری" میں ڈاکٹر سید شاہ علی نے کہا ہے کہ مستقل سوانح عمری اور شخصی مرقعہ کا فرق ناول اور افسانے کا قیاس کیا جاسکتا ہے۔ اور یہ کہ شخصی مرقعے دلچسپی اور مقبولیت میں غزل اور مختصر افسانے کے حریف ہیں۔ افسانے خیالی افراد کے شخصی مرقعے ہی ہوتے ہیں۔ مختصر خاکہ میں شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اس انداز سے نمایاں کرنا کہ پڑھنے والے کے ذہن میں وہی تصور ابھرے جو سوانح نگار کے پیش نظر ہو اور وہی ارتسامات اور تاثرات قائم ہوں جو سوانح نگار قائم کرنا چاہتا ہے اور پھر یہ سب حقیقت

کے دائرہ سے باہر نہ جانے پائیں بڑا ہی مشکل نازک اور فنی کام ہے۔ اگر کسی طرح اس دشواری پر قابو پالیا جائے تو سوانحی خاکے افسانوں سے زیادہ دلچسپ ہو سکتے ہیں۔ افادیت اور مقصدیت کے اعتبار سے تو یہ یقیناً افسانوں پر فوقیت رکھیں گے۔ کیوں کہ یہ حقیقت ہیں۔ شخصی مرقعہ نگاری مستقل سوانح نگاری کے مقابلہ میں زیادہ مشکل کام ہے کیونکہ اس میں ایجاز نگاری کی مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور سوانحی مواد کے لب لباب کو پیش کرنا ہوتا ہے۔ سوانحی شعور اور تربیت یافتہ مذاق بھی درکار ہے۔ نیز موضوع کی زندگی کے اہم واقعات کے انتخاب کا سلیقہ چاہیئے۔ ان تاثرات کے پس منظر میں گزشتہ چند سالوں میں، میں نے سوانحی مضامین لکھنے کی جسارت کی جو اردو کے ممتاز جرائد میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے اور پسند کئے گئے۔ اس ہمت افزائی کے نتیجہ کے طور پر ان کا انتخاب زباں کے ایک اہم گوشہ کی حقیر خدمت سمجھ کر دلّا اکیڈیمی کے سلسلہ مطبوعات کی ایک کڑی کی حیثیت سے پیش خدمت ہے۔ شخصیتوں سے متاثر ہو کر ہی میں نے سوانحی خاکے لکھے ہیں لیکن ان کا انتخاب غیر شعوری طور پر کسی خاص اور ناقابل بیان اثر اور کشش کے تحت ہوا۔ اس طرح خاکے مرتب ہوتے رہے۔ جب ان کو جمع کیا گیا تب یہ محسوس ہوا کہ ایک خاص بزم سنور گئی ہے ایک محفل آراستہ ہو گئی ہے اور ایک انجمن وجود میں آگئی ہے ایسی انجمن جس کا ہر فرد اپنی جگہ خود ایک انجمن ہے اور بھی شخصیتیں ہیں جن کے خاکے مرتب کرنے کی دلی خواہش کچھ میری بے بضاعتی اور کچھ عدم فراہمی مواد کے باعث شرمندۂ تکمیل نہ ہو سکی۔ میں نہیں جانتا کہ اس کوشش میں کوئی کامیابی بھی ہوئی ہے یا نہیں البتہ یہ جانتا ہوں کہ جو خاکے مرتب ہوتے وہ کمال کو حاصل کرنے کی سعی ناتمام ہے۔ اگر یہ پسند خاطر ہوں تو ان ہی شخصیتوں کی دلکشی اور انوکھے پن کی وجہ سے ہے اگر یہ ترجمانی آپ کو پسند نہ آئے تو یہ میری اپنی کوتاہی ہے۔

حسن الدین احمد

سی۔ ۳۰ کرزن روڈ اپارٹمنٹ نئی دہلی

انوکھا درباری

حضرت امیر خسرو دہلوی (۱۲۵۳ - ۱۳۲۵ء) ایک جامع الکمال شخصیت کے حامل تھے وہ صوفی اور سپاہی۔ ادیب وشاعر۔ ماہر موسیقی۔ رواداری اور وسیع المشربی کے علمبردار ہندوستان اور ہندوستانیت کے قدردان تو تھے ہی لیکن وہ ساتھ ہی فن درباری کے بھی بڑے ماہر تھے۔ ان کی اور خوبیوں کا تو ذکر و اعتراف کیا جاتا ہے لیکن ان کے سب سے اہم جس کمال کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے وہ ہے فن درباری حالانکہ اس سلسلہ میں ان کے بتلائے ہوئے راستے آج بھی ہمارے لئے نہایت کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں اور زمانہ کی تبدیلی کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کے طریقوں سے ہم آج بھی اپنی زندگی میں بہت کچھ کام لے سکتے ہیں۔

عہد وسطی میں بادشاہوں اور امرا کے درباروں سے ہر فن صلاحیت اور ہر مرتبہ کے آدمی وابستہ رہتے تھے۔...... دل بہلانے کے لئے گویئے اور مسخرے بھی ہوتے تھے اور علماء و فضلا بھی عام طور پر درباری جی حضوری ہوا کرتے تھے یہی وجہ ہے کہ درباری کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ امیر خسرو نے درباری ضرور کی لیکن انھوں نے اپنے رویہ اور طریقہ سے اس پیشہ کے وقار کو بڑھایا اور دربار میں باعزت زندگی گذاری۔

کامیاب درباری کے لئے ضروری ہے کہ پورے ماحول پہ نظر رکھے کسی ایک رخ سے وابستگی کافی نہیں ہے۔ امیر خسرو سارے ماحول پر چھائے رہے۔ ان کو بنیادی طور پر زندگی اور اس کے اعلیٰ اقدار سے محبت تھی اس محبت کی وجہ سے ان کی زندگی میں تنوع نظر آتا ہے۔ بادشاہوں کی ان پر نظر عنایت تھی۔ اور وہ امیر خسرو... کو عزت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ امیر خسرو بھی بادشاہ کی نظروں کو دیکھتے تھے۔ اور ان کے تیور پہچانتے تھے امرا سے ان کے مراسم تھے اہل علم سے ان کے تعلقات تھے شاعری میں ان کو کمال اور شاعروں سے سابقہ تھا۔ حضرت نظام الدین اولیاء سے ان کو کمال عقیدت تھی عوام سے ان کو محبت تھی اور عوام بھی ان کو اپنا اور دلجا سمجھتے تھے۔ عوام میں ان کو بے پناہ مقبولیت حاصل تھی۔ ان کی زندگی کا یہ تنوع دربار میں ان کے لئے سازگار ثابت ہوا۔ کامیاب درباری کے لئے ضروری ہے کہ یا تو بادشاہ وقت کو خوش رکھا جائے یا مرعوب۔ امیر خسرو نے اپنے علم ہنر قابلیت اور ہمہ دانی سے بادشاہوں کو مرعوب بھی رکھا اور اپنی بذلہ سنجی طبیعت کی موزونیت حاضر جوابی وغیرہ کی وجہ سے بادشاہوں کو خوش بھی رکھا۔ بلکہ انھوں نے خود کو دربار کا ناگزیر حصہ بنائے رکھا ـــــــــ وہ امرا اور بادشاہ جن کے دربار سے امیر خسرو وابستہ رہے انھوں نے امیر خسرو کو عزت و احترام کی نظر سے دیکھا۔

دربارداری ایسا نازک فن ہے جس میں انسان کے ظرف کا پتہ چلتا ہے بادشاہ کی قربت سے بہت سوں کے دماغ کا توازن قائم نہیں رہتا اور یہی بات درباری کو بادشاہ کی نظروں سے بھی گرا دیتی ہے اور سازشوں کا شکار بنا دیتی ہے ـــــ...... وہاں ماحول کو اصول و قاعدے سے برتنا ہوتا ہے ـــــــــ

ـــــــــ وہاں انسان کو اپنی تمام دماغی صلاحیتوں اور سمجھ

بوجھ کا پورا پورا استعمال کرنا ہوتا ہے۔ بادشاہوں اور درباریوں کی نفسیات کو سمجھنا ہوتا ہے۔ مصلحت اور دوراندیشی سے کام لینا ہوتا۔ اونچے انداز سے سوچنا اور بے تعلقی سے رہنا ہوتا ہے وہاں کی دنیا کو ع

دنیا میں ہوں دنیا کا طلب گار نہیں ہوں

کے انداز سے برتنا ہوتا ہے۔

آج دربار تو نہیں رہے لیکن ایسے ماحول اور ایسے حالات ضرور رہتے ہیں جہاں فن درباداری سے بہت کچھ سبق حاصل کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ آج بھی امیر خسرو کی اختیار کی ہوئی راہیں دانشوروں کے لئے مشعل راہ بن سکتی ہیں۔ دانشور جن کو آج بھی ماحول، حالات اور سیاست سے آئے دن سابقہ رہتا ہے۔ امیر خسرو نے جس رویہ کی نشاندہی کی ہے اس کو سمجھ کر دانشور ایسے سمجھوتے کر سکتے ہیں جو ناساعد حالات میں جینے، پنپنے اور خدمت کرنے کا موقع دیں۔ اور ایسے طریقے اختیار کر سکتے ہیں جن سے بحیثیت مجموعی ان کے مقاصد کی تکمیل اور اعلیٰ اقدار کی جیت ہو۔

۱۲۲۰ء کے لگ بھگ جب ترکستان میں تاتاریت کا سیلاب آیا تو امرا اور شرفا تباہ و برباد ہو گئے۔ جو باقی بچے تھے ان میں امیر سیف الدین محمود جو بلخ کے لاچینی قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے ہندوستان آئے اور دہلی سے قریب پٹیالی ضلع ایٹہ میں قیام پذیر ہوئے جس کو مومن آباد یا مومن پور بھی کہتے تھے اور امیر خسرو کی سات سو سالہ تقاریب کے سلسلہ میں خسرو نگر کا نام دیا جانا پیش نظر ہے۔

یہ سلطان شمس الدین التمش کا دور تھا امیر موصوف کی رسائی بہت جلد سلطان کے دربار میں ہوئی۔ اور انھوں نے مع اپنے پانچوں کے سلطانی ملازمت اختیار کر لی۔ اور

توسیع سلطنت میں سلطان کی مدد کی۔ پھر امیر کی شادی دہلی کے ایک باکمال بزرگ ملک عمادالملک کی صاحبزادی سے ہوئی۔ ان کے بطن سے تین لڑکے پیدا ہوئے عزالدین علی شاہ۔ ابوالحسن یمین الدین اور حسام الدین۔ یہی ابوالحسن یمین الدین آگے چل کر خسرو شیریں سخن ہوئے جن پر ان کے ملک ہندوستان ہی کو نہیں فارسی ہی کو نہیں عام انسانیت کو۔۔۔ ناز ہے۔

امیر خسرو ۴ سال کی عمر تک پٹیالی میں رہے اس کے بعد ان کے والد امیر سیف الدین ان کو دہلی لے گئے۔ اور وہاں ان کی تعلیم کا بہتر سے بہتر انتظام کیا امیر خسرو نے امارت کے ماحول میں آنکھیں کھولیں اعلیٰ درجہ کی تعلیم اور معیاری تربیت نے طبیعت میں جو جوہر تھے ان کو جلا دی۔ ان سب کے امتزاج سے آگے چل کر فن درباداری میں کمال حاصل کیا۔

امیر خسرو نے اپنے والد کے ہمراہ سلطان شمس الدین التمش کے فرزند اور جانشین سلطان ناصر الدین محمود کے دربار کا طمطراق ضرور دیکھا ہوگا۔

۱۲۶۰ء کے آس پاس جب کہ امیر خسرو کی عمر سات سال کی تھی چنگیز خاں کے پوتے ہلاکو خاں کا سفیر سلطان ناصر الدین محمود کے دربار میں آیا تھا مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی کے الفاظ میں جب یہ سفیر دربار سلطانی میں داخل ہوا تو وہاں اور بھی زیادہ مرعوب کن نظارہ پیش نظر ہوا۔ تمام دربار جگمگا رہا تھا۔ سونے اور چاندی اور جواہرات کے آرائشی سامان اور حشمت شاہی کی عظمت سے دلوں پر ہیبت طاری ہوتی تھی۔ سلطان تخت پر جلوہ افروز تھا تخت کے ایک پہلو پر سادات ومشائخ وقضاۃ عظام کی صف تھی۔ دوسری جانب ان تمیس شہزادوں اور بادشاہوں کی قطار تھی جو خراسان، ایران، عراق آذربائیجان وغیرہ ممالک سے بھاگ کر یہاں آئے تھے انکی سلطنتیں مغلوں کے ہاتھوں برباد ہوئی تھیں یہ سب بھی شاہی

مہمان تھے ان کے علاوہ بڑے بڑے امرائے علمدار و سپہ سالار و عمال سلطنت ایک صف میں مؤدب کھڑے تھے ایک قطار ہندو رانوں راجاؤں اور راے زادوں کی تھی جو دست بستہ تخت شاہی کے گرد کھڑے تھے مشہور شاعر منہاج سراج (مصنف طبقات ناصری) نے اس موقع پر یہ اشعار موزوں کئے تھے۔

زہے جشنے کزاں اطراف چوں خلد بریں گشتہ — فضے بر کہ کز و اکناف عالم راستیں گشتہ

ز ترتیب نہاد و رسم و آئیں نشاط او — تو گفتی عرصۂ دہلی بہشت ہشتمیں گشتہ

ز فر ناصر الدین شاہ محمود التتمش — ملک از دولتش دعا خواند و بہشتیں زمیں گشتہ

شہنشاہے کہ در عالم بہ فیض فضل ربانی — سزاے چتر شاہی لائق تخت و نگیں گشتہ

چو خاقانان چین آور چو سلطانان دین پرور — بدل ماحی کفر است و بجان حامی دیں گشتہ

مبارک باد بر اسلام این بزم شہ عالم — کز این ترتیب ہندستاں بہ خوشتر چیں گشتہ

ہمیں از جملہ شاہان باد بر بندہ زر دمگاہش — چو منہاج سراج از جان دعا گوئے ہمیں گشتہ

ہلاکو کے سفیر پر اس شان و شوکت کے معائنہ سے ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ اس سفیر کی واپسی کے بعد ہلاکو خان نے ہندوستان پر حملہ کرنے کے خیال کو ترک کر دیا اور اپنے سرحدی امیروں کے پاس احکام بھیج دیئے کہ آئندہ ہندوستان پر ہرگز کوئی حملہ نہ ہو۔ یہ اثر تو ایک سفیر پر ہوا ایک سات سال کے ذکی الحس لڑکے پر اس پرشکوہ ماحول کا جو اثر ہو سکتا ہے وہ ظاہر ہے یہی وہ عمر ہوتی ہے جب ایک لڑکا اپنی زندگی کا خاکہ اپنے ذہن میں قائم کرتا ہے۔

امیر خسرو ابھی نو سال کے بھی نہ ہونے پاتے تھے کہ ان کے والد امیر سیف الدین محمود ایک لڑائی میں کام آئے اس واقعہ نے بھی آپ کے ذہن کو کافی متاثر کیا۔ وہ جس دور سے تعلق رکھتے تھے اسکے اقتضاء کے لحاظ سے سیف کو چھوڑ تو نہ سکتے البتہ قلم کو اور دلوں کو ملانے والے حضرت

نظام الدین اولیاء کے در کو انھوں نے مضبوطی سے پکڑ لیا۔

والد ماجد کے انتقال کے بعد امیر خسرو کی تعلیم و تربیت ان کے نانا ملک عماد الملک کی نگرانی میں ہوئی۔ بچپن ہی سے ان کا رجحان شاعری کی جانب تھا۔ آٹھ نو سال کی عمر سے شعر موزوں کر لیتے تھے۔ اور نہایت شیریں اور مترنم آواز میں اشعار سناتے تھے۔ اور سامعین کو محظوظ کرتے۔

کچھ روایات کے بموجب ملک عماد الملک کے ہاں کچھ روز حضرت نظام الدین اولیاء کا قیام بھی رہا تھا۔ اس طرح خسرو کو بچپن ہی سے اس برگزیدہ شخصیت سے استفادہ کا موقع ملا۔ حضرت نظام الدین اولیاء کی شخصیت ان کو یقیناً انوکھی نظر آئی ہو گی۔ جو ان کے امارت کے احول سے بالکل مختلف تھی۔ اس لئے اس شخصیت نے ان کو نہ صرف اپنی جانب متوجہ کیا بلکہ ان پر بے پناہ اثر انداز بھی ہوئی۔

اس اثر کو دیکھ کر امیر خسرو نے ۱۲۷۵ سے ۱۳۲۵ تک یعنی کم و بیش ۵۰ سال تک سیاسی ماحول میں زندگی گزاری۔ دربار وں سے ان کا تعلق رہا۔ اس مدت میں خونیں انقلابات آتے بادشاہوں وامراء کے خاندانوں پر تباہیاں آئیں تخت و تاج کے لئے باپ بیٹے اور بھائی بھائی تک ایک دوسرے کے دشمن جانی ہو گئے اور نتیجتاً خاندان کے خاندان تباہ و تاراج ہو گئے لیکن امیر خسرو کے اعزاز میں فرق نہ آیا انداز میں بھی فرق نہ آیا۔ انھوں نے سیاست کے بیچ میں رہتے ہوئے بھی خود کو سیاست سے بچائے رکھا وہ سیاست کو سمجھتے تھے۔ اس کو جانتے ہوئے بھی انھوں نے اس کی ظاہری دلکشیوں پر قابو پایا اور اس سے کنارہ کش رہے۔ وہ بادشاہوں، شہزادوں رئیسوں سے وابستہ ضرور رہے لیکن ہمیشہ منکسر المزاج رہے۔ خوش اخلاقی ہمدردی مساوات غربا پروری جیسے اوصاف حمیدہ سے متصف رہے۔ صلح کل کے قائل تھے فطرت میں رعونت نام کو نہ تھی۔ مزاج میں تکلف اور شان کا شائبہ تک نہ تھا۔ دل آزاری کو گناہ

سمجھتے تھے ۔ تعصب سے سروکار نہ تھا ۔ صوفی منش انسان تھے ۔ عوام کے سچے ہمدرد تھے ۔

۱۲۷۲ء میں جب کہ امیر خسرو کی عمر بیس سال کی تھی ان کے نانا عماد الملک کا انتقال ہوگیا اس کے بعد ان کو فکر معاش دامن گیر ہوئی ۔ ایک کامیاب درباری کے لئے جتنے اوصاف ضروری ہیں یعنی دلاویزی ذہانت حاضر دماغی و بیداری سخن آرائی بذلہ سنجی خوش الحانی یہ سب امیر خسرو میں بدرجہ اتم موجود تھیں ان ہی باتوں کو شہزادے اور امرا اپنے ندیم یا مصاحب کے لئے ضروری خیال کرتے تھے اس وقت تک امیر خسرو کا شہرہ عام ہو چکا تھا ہر امیر چاہتا تھا کہ وہ اس کے دربار میں آجاویں ۔ سب سے پہلے امیر خسرو سلطان بلبن کے بھتیجہ ملک علاء الدین محمد کشلی خاں عرف ملک چھجو کے دربار سے وابستہ ہو گئے جو باربکی کے عہدے پر مامور تھے ۔

امیر خسرو نے ان کی شان میں قصیدے لکھے دور دراز کے اہل کمال کشلی خاں کے دربار میں موجود رہتے تھے ۔ امیر خسرو نے دو سال ان کے ساتھ نہایت آرام سے گذارے ایک رات ملک چھجو کی محفل میں بلبن کے چھوٹے فرزند بغرا خاں نے شرکت کی ۔ امیر خسرو نے اپنی شیریں زبان اور لحن سے ساری محفل پر ایک وجد کی کیفیت طاری کر دی ۔ بغرا خاں نے متاثر ہو کر خسرو کو ایک لگن بھر کر چاندی کے سکے دیئے یہ بات کشلی خاں کو ناگوار گذری اور ان کے چہرہ سے ناگواری کے آثار ظاہر ہوئے خسرو نے ان کو ہر طرح منانے کی کوشش کی جب ناگواری دور ہوتی نظر نہ آئی تو امیر خسرو وہاں سے بھاگ نکلے ۔ انھوں نے بغرا خاں کے دامن میں پناہ لینا مناسب سمجھا بغرا خاں نے ان کو اپنے خاص مصاحبین میں شامل کر لیا زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ بلبن نے بغرا خاں کو لکھنوتی کے حاکم ملک طغرل کی سرکوبی کے لئے اپنے ساتھ چلنے کا حکم دیا ۔ بغرا خاں نے خسرو کو بھی ساتھ چلنے کے لئے کہا ۔

جب طغرل کی بغاوت کا قلع قمع ہو گیا تو بلبن نے بغرا خاں کو بہت سی نصیحتیں کر کے

لکھنوتی اور بنگالہ کی حکومت سپرد کر دی شہزادہ کی صلاح و مشورہ کے لئے اس زمانہ کے مشہور شاعر و ادیب شمس الدین دبیر کو مشیر مقرر کیا شمس الدین دبیر نے کوشش کی کہ خسرو بھی ان کے ساتھ رہیں لیکن بغرا خاں اور کشلی خاں کی باہمی رنجش کی وجہ سے بغرا خاں کے پاس رہنا خلاف مصلحت سمجھ کر خسرو نے معذرت کی اور شاہی لشکر کے ساتھ دہلی کے لئے روانہ ہو گئے فتح کی خوشی میں گھر گھر چراغاں کیا گیا تھا۔ بلبن کے بڑے فرزند سلطان محمد جو ملتان کے حاکم تھے اس جشن مسرت میں شرکت کے لئے آئے شہزادہ سلطان محمد خسرو کا کلام سن کر ان کے گرویدہ ہو گئے اور یہ خواہش کی کہ خسرو ان کے ساتھ ...... وابستہ ہو جائیں اور ملتان چلیں چنانچہ خسرو سلطان محمد کی مصاحبت میں ملتان گئے اس وقت خسرو کی عمر ۲۸ سال کی تھی۔ سلطان محمد نے ان کو مصحف دار مقرر کیا نچلے طبقہ کے امرا میں ان کا شمار ہوتا تھا ۱۲۸۴ء میں ایک معمولی منگول حملہ میں سلطان محمد شہید ہو گئے۔ خسرو جوان کے ساتھ تھے شہزادہ کی شہادت کے بعد چنگیزیوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے ۔ اور کافی صعوبتیں برداشت کرنے کے بعد رہائی پائی خسرو نے سلطان محمد کی شہادت پر ایک پر درد مرثیہ لکھا۔ یہ مرثیہ ہندوستان کے فارسی دانوں میں بہت زیادہ مقبول ہوا۔

اس طرح خسرو کو دربار سے وابستگی کا خاصا تجربہ ہوا۔ مختلف اقطاع ہند کے سفر کا موقع ملا مختلف شخصیتوں سے سابقہ رہا۔ اور فن دربارداری میں مہارت حاصل کرنے کا موقع ملا۔

سلطان محمد کی شہادت کے بعد بلبن کے آخری زمانہ میں حالات غیر یقینی تھے یہ معلوم نہ ہو سکا تھا کہ آئندہ سلطنت کی تشکیل کیا ہو گی۔ اس لئے خسرو نے امیر علی سرجاندار کی مصاحبت اختیار کر لی جو بعد کو حاکم اودھ مقرر ہو گئے۔ امیر خسرو نے اپنے دیوان میں امیر علی سرجاندار کی

بڑی تعریف کی ہے۔ اوراسپ نامہ ان ہی کے نام پر لکھا ہے۔ خسرو امیر علی سر جاندار کے ساتھ دو سال اودھ میں رہے۔ اس جگہ کی انھوں نے جابجا تعریف کی ہے۔ امیر خسرو نے امیر علی سر جان دار کی مصاحبت مصلحت وقت سے اور وقت گزاری کے لئے کی تھی۔

بلبن کے انتقال کے وقت انکے چھوٹے فرزند بغرا خاں بنگال میں تھے نظام الدین وزیر نے بلبن کی وصیت کے خلاف خسرو کو ملتان میں عملاً نظر بند کر دیا اور بغرا خاں کے لڑکے کیقباد کو جن کی عمر اس وقت ۱۷۔۱۸ سال کی تھی تخت پر بٹھا دیا کیقباد ..... تخت نشین ہوتے ہی امور سلطنت مفاد پرست امیروں کے سپرد کر کے خود عیش وعشرت میں معروف ہو گئے نظام الدین وزیر نے ہر چند چاہا کہ امیر خسرو اس کے دربار سے وابستہ ہو جاویں لیکن انھوں نے کمال دور اندیشی سے اس بات کو قبول نہ کیا۔ البتہ دو سال بعد جب اپنی والدہ سے ملنے دہلی آئے تو حالات کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ اس وقت کیقباد نے انھیں طلب کیا اور خسرو سلطان معزالدین کیقباد کے دربار میں پہنچ گئے اس کے بعد آخر تک شاہی دربار میں رہے۔ کیقباد کی فرمائش پر آپ نے چھ ماہ کی کاوش سے ایک مثنوی قرآن السعدین لکھی۔ جس میں کیقباد کی اپنی والد بغرا خاں بادشاہ بنگال سے ملاقات کا ذکر ہے کیقباد کے دربار سے امیر خسرو کی وابستگی صرف ندیم یا مصاحب کی حیثیت سے نہیں بلکہ ملک الشعرا کی حیثیت سے رہی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ امیر خسرو کو ملک الشعرا کا خطاب ملا۔ یہ مرتبہ بعد میں بھی قائم رہا۔ کیقباد کے قتل کے بعد ان کے لڑکے شمس الدین (کیومرث) کو برائے نام بادشاہ بنا کر خلجی خاندان کے ایک امیر شائستہ خاں جلال الدین خلجی نے اپنی اتالیقی میں لیا اور اقتدار اپنے ہاتھ میں لیا۔

جلال الدین سامانہ کے نائب ناظم اور ستر برس کی عمر کے تجربہ کار شخص تھے۔ انھوں نے بہت جلد کیقباد مورث کو بھی راستہ سے دور کرا کے ۱۲۹۰ء میں تخت دہلی پر قبضہ کر لیا۔

امیر خسرو جلال الدین خلجی کی اتالیقی کے زمانہ میں ان کے مصاحب رہ چکے تھے۔ جلال الدین خلجی نے امیر خسرو کو مصحف دار کا عہدہ دیا۔ آپ کا ایک کام غزلیں لکھنا تھا جو بادشاہ کی محفل میں پڑھی جاتی تھیں۔ امیر خسرو کے پرانے مربی ملک چھجو اور امیر علی سرجاندار نے سلطان جلال الدین خلجی کے خلاف بغاوت کی۔ یہ امیر خسرو کے لئے نازک موقع تھا لیکن انھوں نے کمال ہوشیاری سے اس پر قابو پایا۔ جلال الدین خلجی نے باغیوں کو شکست دی امیر علی سرجاندار کو معاف کر دیا ملک چھجو کو قید کر کے ملتان بھیجا دیا۔ امیر خسرو نے سلطان ... جلال الدین خلجی کی جنگوں پر ایک چھوٹی سی مثنوی مفتاح الفتوح لکھی اس مثنوی میں امیر خسرو نے اپنے پرانے مربیوں سے کسی قسم کا اظہار عقیدت نہیں کیا اسی زمانہ میں ان کو امارت ملی اور وہ امیر خسرو کہلانے لگے۔ اور ان کا وظیفہ بارہ ہزار تنکہ مقرر ہوا۔ امیر خسرو کے لئے یہ دربار سب سے زیادہ موزوں تھا کیوں کہ صرف خود جلال الدین خلجی صاحب مذاق زندہ دل اور خوش صحبت تھے اور شعر و شاعری سے ان کو شوق تھا بلکہ مصاحب بھی باذوق تھے۔

سلطان جلال الدین خلجی کے عہد کے ایک واقعہ سے امیر خسرو کے دربار سے تعلق پر روشنی پڑتی ہے۔ سلطان جلال الدین خلجی نے حضرت نظام الدین اولیاء سے ملنے کا ارادہ راز میں امیر خسرو پر ظاہر کیا۔ امیر خسرو نے حضرت نظام الدین اولیاء کو اس کی اطلاع دے دی۔ حضرت نظام الدین اولیاء جو بادشاہ سے ملاقات کو ٹالنا چاہتے تھے۔ فوراً اجودھن شیخ فرید کی زیارت کے لئے روانہ ہو گئے۔ سلطان امیر خسرو سے رنجیدہ ہوئے کہ کیوں اس بات کو ظاہر کر دیا۔ امیر خسرو نے جواب دیا کہ بادشاہ کی خفگی سے خوف جان ہے

لیکن شیخ کی خفگی سے ایمان ضائع ہونے کا خوف ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امیر خسرو محض درباری نہ تھے دربار میں گویا شیخ نظام الدین اولیاء کے سفیر اور نمائندے تھے۔ یہ تو ایک انداز تھا کیونکہ معاملہ سلطان جلال الدین خلجی سے تھا جو شرافت اور عقیدت کے اس انداز کو سمجھتا تھا لیکن جب معاملہ سلطان علاء الدین خلجی سے ہوا تو اپنا طریقہ مختلف رکھا قطب الدین مبارک شاہ کے عہد میں بادشاہ کے رویہ کو نامناسب پاتے ہیں تو مثنوی نہ سپہر میں پند و نصیحت کی شکل میں بادشاہ کو اپنے فرائض سے آگاہ کرتے ہیں۔ اور یہ بتاتے ہیں کہ اچھے حکمران کو کیسا ہونا چاہئے۔

امیر خسرو کا جن بادشاہوں سے سابقہ رہا ان میں سے اکثر کے تعلقات حضرت نظام الدین اولیاء سے اچھے نہ تھے اور بلا کسی معقول وجہ کے ان بادشاہوں نے امیر خسرو کے پیر طریقت سے تناؤ پیدا کر لیا تھا۔ امیر خسرو کی کمال مصلحت تھی کہ انھوں نے ایسے درباروں سے بھی نبھاؤ کر لیا۔

امیر خسرو مرنجان مرنج طبیعت ضرور رکھتے تھے لیکن درباری زندگی میں بعض شخصیتوں سے انھوں نے کوئی تعلق نہ رکھا بلبن کے انتقال پر ملک الامرا فخر الدین کوتوال کے بھتیجہ اور داماد نظام الدین وزیر نے بڑی قوت حاصل کر لی تھی اس نے ہر چند اس بات کی کوشش کی کہ امیر خسرو اس کے دربار سے وابستہ ہو جائیں لیکن انھوں نے کمال دور اندیشی سے اس بات کو قبول نہ کیا۔ اسی طرح سلطان علاء الدین خلجی کے آخری ایام میں ملک کافور نے اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ امیر خسرو نے اس سے بھی تعلقات نہ رکھے خسرو خاں نے قطب الدین مبارک شاہ کو قتل کر کے خود تخت پر فائز ہو گیا اس زمانہ میں بھی امیر خسرو نے دربار سے کوئی تعلق نہ رکھا حالانکہ خسرو خاں نے حضرت نظام الدین

اولیاء سے عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے ۵ لاکھ تنکے بھیجے تھے جو فوراً حاجتمندوں میں تقسیم کر دیئے گئے۔ بادشاہوں کا عروج و زوال حکومتوں کی تبدیلی یکے بعد دیگرے مختلف خاندانوں کا اقتدار حاصل کرنا یہ سب امیر خسرو نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ان خاندانوں سے مختلف طبقات اور ان کے مفادات وابستہ تھے ہر خاندان کا زوال ان کے متوسل طبقات اور مفادات کی تباہی و بربادی کے مترادف تھا۔ ان انقلابوں اور سیاسی تغیرات نے شریف خاندانوں اور اہل کمال کو بری طرح متاثر کیا۔ اور جو امراء کسی ایک دور میں دربار سے وابستہ ہوتے اس کے اختتام پر انھیں غیر معمولی مصائب کا سامنا کرنا پڑتا۔ اور اہل و عیال کی تباہی کا باعث بھی بننا پڑتا امیر خسرو کو یہ امتیازی خصوصیت حاصل ہوئی کہ ہر بادشاہ نے ان کی قدر کی اور عزت و احترام کے ساتھ اپنے دربار میں جگہ دی۔

امیر خسرو نے بادشاہوں کے دربار میں رہ کر شاعری کی اور شاعری میں اکثر و بیشتر وقائع نگاری کی بقول مولانا شبلی "قران السعدین کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ نظم اور لطائف کی پابندی کے ساتھ تاریخی حیثیتیں بہ تمام ملحوظ رکھی گئیں ہیں۔ اس طرح کہ کوئی نثر لکھتا تو اس سے بڑھ کر ان باتوں کو نہ لکھتا۔ یہی حال دول رانی خضر خان تغلق نامہ خزائن الفتوح (مفتاح الفتوح) کا بھی ہے کسی اور ادب میں یہ خصوصیت شاید ہی ملیگی کہ شاعری تاریخ کا اتنا اہم ماخذ قرار پائے ظاہر ہے کہ اگر امیر خسرو درباروں سے وابستہ نہ رہتے تو انھیں یہ موقع نہ ملتا۔ اگر ایک طرف دربار سے تعلق کی وجہ سے امیر خسرو کو اپنی ادبی صلاحیتوں کو نکھارنے کا موقع ملا تو دوسری طرف دربار کی مصروفیت کے باعث اور درباری فرمائشات کی تکمیل میں ان کی شاعرانہ صلاحیتیں متاثر بھی ہوتی ہیں۔ امیر خسرو نے نظامی گنجوی کے خمسہ (یعنی پانچ مثنویوں مخزن اسرار خسرو شیریں۔ لیلے مجنوں۔ ہفت پیکر۔ سکندر نامہ) کے مقابلہ میں خمسہ لکھا جو پانچ

مثنویوں مطلع الانوار شیریں خسرو لیلیٰ مجنوں آئینہ سکندری اور ہشت بہشت پر مشتمل تھے۔ بقول مولانا شبلی اگرچہ اس میں شبہ نہیں کہ نظامی کے جواب میں جس قدر خمسے لکھے گئے ہیں ان میں نسبتاً امیر صاحب کا خمسہ بہتر ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں بعض نظامی گنجوی کی تصنیف سے کچھ نسبت نہیں رکھتیں مطلع الانوار میں صاف خامی نظر آتی ہے اور آئینہ سکندری بالکل پھیکی اور کمزور ہے اس کے بعد مولانا شبلی فرماتے ہیں "اس کمی کے مختلف اسباب ہیں مثنوی امیر صاحب کا اصلی مذاق نہیں۔ سلاطین کی فرمائش سے وہ مثنویاں لکھتے تھے اور گویا بیگار ٹال لیتے تھے چنانچہ خمسہ کا خمسہ دو سوا دو برس میں لکھا ہے اور مطلع الانوار صرف دو ہفتہ کی کمائی ہے۔ ظاہر ہے کہ فرمائش کی تکمیل پر مجبور نہ ہوتے اور اپنی پسند سے لکھتے تو ان کی غیر معمولی ادبی صلاحیتوں کے پیش نظر ان کی شاعری اور بھی اعلیٰ معیار کی ہوتی اسی طرح دربار میں ان کا وقت مصاحبت اور دوسرے امور پر صرف نہ ہوتا تو وہ وقت بھی شاعری کے معیار کو اونچا کرنے میں صرف کرتے لیلیٰ مجنوں کے خاتمہ پر لکھتے ہیں نظامی کو شاعری کے سوا کوئی شغل نہ تھا اور کسی قسم کی بے اطمینانی نہ تھی میرا حال یہ ہے کہ پاؤں کا پسینہ سر پر چڑھ جاتا ہے تب روٹی ملتی ہے۔

امیر خسرو نے یہ اصول قائم کیا کہ دہلی کے تخت و تاج سے عقیدت قائم رکھی جائے۔ ذاتی اغراض کے تحت جو اقتدار کی رسہ کشی ہو رہی تھی اس سے کوئی تعلق نہ رکھا جائے جو بھی سلطان ہوتا اس کے ذاتی افعال وکردار اور عادات واطوار سے قطع نظر اور مفاد عامہ کے پیش نظر اس کے وفادار ہوتے اور اس کی مدح لکھتے جو امرا تخت و تاج کے لئے سینہ سپر رہے ان کی تعریف و توصیف دل کھول کر کرتے جو بھی تخت و تاج کے مخالف ہوتا اس کی ہجو کرتے۔ مفتاح الفتوح اور نہ سپہر میں تخت و تاج کے مخالفین کے لئے سخت الفاظ استعمال کئے ہیں

اس سلسلے میں ان کا نقطۂ نظر مثبت اور تعمیری تھا۔ جہاں تک ان کے بس میں ہوتا نیک مشورے دینے میں دریغ نہ کرتے امرا کو نصیحت کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ کہ پہلے خدا کی اطاعت گذار ہوں پھر سلطان کے فرمانبردار درباری رسم کے بموجب بادشاہوں کی مدح ضرور کی ہے لیکن بادشاہوں کی مدح کو اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ مولانا شبلی لکھتے ہیں۔

"امیر خسرو صاحب اگرچہ خاندان کے اثر سے شاہی دربار سے تعلق رکھتے تھے اور اس قسم کی زندگی بسر کرتے تھے جو عام دنیاداری کا طریقہ ہے لیکن یہ امران کی اصل فطرت کے خلاف تھا۔ دربارداری۔ خوشامد اور شخص پرستی سے ان کو طبعی نفرت تھی اور موقع بہ موقع ایسے خیالات بے اختیار ان کی زبان سے نکل جاتے تھے۔ لیلےٰ مجنوں ۶۹۰ ہجری میں لکھی تھی جب ان کو سلطان علاءالدین خلجی جیسے جبار بادشاہ سے تعلق تھا۔ تاہم خاتمہ میں لکھتے ہیں۔

شب تا سحر و ز صبح تا شام	در گوشۂ غم نگیرم آرام
چشم ز پے لقمہ نفس خود را	پیش چو خودے ستادہ برپائے
تا خون نہ رود ز پائے تا سر	دستم نہ شود ز آب کس تر

(یعنی نفس پروری کی وجہ سے اپنے ہی جیسے کے آگے صبح تا شام مودب کھڑا رہتا ہوں جب تک پاؤں کا پسینہ سر تک نہیں پہنچتا کھانا کھانے کو نہیں ملتا۔)

مولانا شبلی ایک اور جگہ لکھتے ہیں "ان کے (امیر خسرو کے) مدحیہ مضامین ہمیشہ بدمزہ اور پھیکے ہوتے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دل سے ان کو پسند نہیں صرف معاش کی ضرورت سے ذلت گوارا کرتے ہیں اس لئے قصیدہ میں اور مضامین کو لیتے ہیں اور ان میں زور طبع دکھاتے ہیں۔ مثلاً بہار کا سماں۔ برسات کی رت صبح و شام کی کیفیت وغیرہ"۔

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ فن کار اپنے ذاتی اغراض کی خاطر سیاسی مفادات کے آلہ کار

بن جاتے ہیں امیر خسرو کی بڑائی اس میں تھی کہ انھوں نے نہ صرف یہ کہ ایسا نہیں کیا بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ انھوں نے بادشاہوں کو بھی اپنے اعلیٰ مقاصد کے لئے استعمال کیا۔ انھوں نے مفادات عاجلہ کی طرف دھیان نہ دیا سیاست میں دخل نہ دیا۔ اور سلطنت سے سروکار نہ رکھا منشی محمد سعید احمد مارہروی حیات خسرو میں لکھتے ہیں ,, انھوں نے (امیر خسرو نے) باوجود اس کے کہ جاہ وجلال کے ایسے اوج کمال پر پہنچے کہ جہاں تک پہنچنا کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے نہایت دانشمندی سے کسی وقت بھی امور سلطنت میں دخل نہیں دیا نہ سلطنت کی کسی مالی وملکی خدمت کا لینا پسند کیا۔ اس دانشمندانہ حکمت عملی کی جس قدر تعریف وتوصیف کی جائے کم ہے,, امیر خسرو نے نہایت ماہرانہ اور تجربہ کارانہ طریقہ پر اور کمال دوراندیشی سے اپنے ادبی اور فنی دائرہ عمل کا تعین کیا ۔ احتیاط پسندی کو اپنا وطیرہ بنایا اس خوش قسمت شخص نے قدرت سے ودیعت کی ہوئی غیر معمولی صلاحیتوں کا استعمال وقتی مفادات کے حاصل کرنے پر صرف نہ کیا ایسا کرنے میں غیر معمولی کشش ضرور تھی انھوں نے ایسی ترغیبات سے بلند ہوکر سوچے سمجھے طریقہ پر اپنی چالیں متعین کیں انھیں اس حکمت عملی کا پورا پورا فائدہ بھی حاصل ہوا اور وہ سیاسی انقلابات کی تمام بلاؤں سے محفوظ و مامون رہے اگر سطحی طور پر دیکھیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امیر خسرو کی صوفی منشی شاعرانہ طبیعت اور دربار داری کے درمیان تضاد ہے لیکن اس زمانہ کے حالات اور امیر خسرو کے خاندانی ماحول پر نظر رکھی جائے ان کی زندگی کے تنوع کا تجزیہ کیا جائے اور جس انداز سے انھوں نے اپنی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو نبھایا اس کو سامنے رکھا جائے تو یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ان کی زندگی میں مکمل ہم آہنگی تھی۔

امیر خسرو حضرت نظام الدین اولیاء کے پیرو ضرور تھے اور ان سے والہانہ عقیدت بھی

رکھتے تھے لیکن جہاں تک بادشاہوں کے تعلقات اور سیاسی زندگی کا تعلق ہے ان کا عمل حضرت نظام الدین اولیاء سے مختلف تھا اور ان کے طریقہ کو سلطان المشائخ کی تائید حاصل تھی۔ حضرت نظام الدین روحانی پیشوا تھے ان کا ہر عمل اپنے بلند مرتبہ کے شایانِ شان ہوتا تھا امیر خسرو درباری شاعر تھے ان کو دنیا کو ساتھ لے کر چلنا ضروری تھا ان کی زندگی سے ہمیں . . . .
یہ سبق ملتا ہے کہ دانشور۔ شاعر فن کار اور زندگی سے گوناگوں تجربے کرنے والے کو ہر زمانہ اور ہر دور میں کیسی سیاست برتنی چاہئے۔ سیاست سے کیسے اور کس حد تک سمجھوتے کرنا چاہئے۔ اپنے مشن کو آگے بڑھانے اور اپنی آواز کو ان تمام تک پہنچانے کے لئے جن کے لئے وہ بلند کی گئی ہے (خواہ مخاطب ہم عصر ہوں یا مستقبل والے) کیسے جتن کرنا چاہئے بعض دفعہ تو ایک طالب علم یہ محسوس کرتا ہے جیسا کہ پروفیسر محمد مجیب نے محسوس کیا کہ امیر خسرو نے ضرورت سے زیادہ سمجھوتے کیے ہیں لیکن ہر ایسے موقع پر حضرت نظام الدین اولیاء ہم کو متنبہ کر دیتے ہیں کہ نہیں "ترک اللہ نے کوئی ایسا سمجھوتہ نہیں کیا جس کو میری تائید حاصل نہ ہو۔ وہ روزانہ دربار سے اپنے مسائل جو ہمارے مشترکہ مسائل تھے لے کر میرے پاس آتا اور میرے مشوروں سے اپنا طریقۂ عمل متعین کرتا۔ اس کی مشکلات اور اس کے راستہ کی صعوبتوں کو میں ہی جانتا ہوں میرے معتقد جو روحانیت کے مختلف مدارج پر تھے اس پل صراط سے واقف نہ تھے جس پر وہ چلتا تھا۔ یہ تو خیالات کی دنیا کی باتیں تھی حضرت نظام الدین اولیاء نے جن کے سفیر کی حیثیت سے امیر خسرو نے بادشاہوں کی درباردار ی کی فرمایا ہے جب قیامت میں سوال ہوگا کہ نظام الدین کیا لایا ہے تو خسرو کو پیش کر دوں گا۔ دعا مانگتے تو خسرو کی طرف اشارہ کر کے فرماتے الٰہی بہ سوزِ سینۂ ایں ترک مرا بہ بخش۔

(بہ شکریہ "آجکل")

طبیب سے ادیب تک

جب جان بارتھ وِک گل کرسٹ نے ایڈنبرا کے جان ہیرِئس ہسپتال سے ڈاکٹری کی تعلیم ختم کی تو ان کے شان و گمان میں بھی نہ ہوگا کہ رہتی دنیا تک ان کا نام طبیب کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک غیر ملکی زبان کے ادیب کی حیثیت سے باقی رہے گا۔

تاریخ میں بہت کم ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ کسی غیر ملکی نے زبان سیکھ کر اس کی ایسی شاندار خدمات انجام دی ہوں کہ زبان کے ساتھ اس کا نام ہمیشہ کے لئے وابستہ ہوگیا ہو۔ اردو ادب کی تاریخ میں جان گل کرسٹ کا نام سنہری حرفوں میں لکھنے کے قابل ہے جنھوں نے اردو نثر کی نشوونما کے ابتدائی دور میں اس زبان کی بنیادی خدمات انجام دیں اور ہماری زبان کے قواعد و لغت کو وسیع پیمانے پر مدون کرنے کا اولین کام انجام دیا۔ ان کا شمار جدید ہندوستانی نثر کے بانیوں میں کیا جاسکتا ہے۔ بقول بابائے اردو مولوی عبدالحق "جو احسان ولی نے اردو شاعری پر کیا تھا اس سے زیادہ نہیں تو اسی قدر احسان جان گل کرسٹ نے اردو نثر پر کیا ہے" اردو کی جو کتابیں گل کرسٹ کی نگرانی میں فورٹ ولیم کالج کے ہندوستانی شعبہ میں تصنیف یا تالیف کی گئیں انھوں نے اردو نثر کا اولین روپ قائم کیا۔ اردو

طباعت کی تاریخ میں بھی اِن کے قائم کیے ہوئے مطبع کو اولیت حاصل ہے۔
گل کرسٹ کچھ عرصہ تک ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے سکریٹری بھی رہے تھے
گل کرسٹ سے پہلے اردو کو فرنگی لوگ Moors مورس کہتے تھے گل کرسٹ نے
پہلی مرتبہ اِس کو ہندوستانی کا نام دیا اور اس کے لئے رومن رسم الخط تجویز کیا۔ انھوں
نے اس بات کی کوشش کی تھی کہ ہندوستان کی ساری زبانیں رومن رسم الخط میں
لکھی جائیں اردو اور ہندی کے بعض محققین کا خیال ہے کہ گل کرسٹ کی لسانی حکمت
عملی نے اردو ہندی کا جھگڑا کھڑا کیا۔ بات دراصل یہ ہے کہ گل کرسٹ نے ایک
نو وارد کی حیثیت سے اس دیس کی مروجہ زبان کی اہمیت کو محسوس کیا۔ اور اس
کو نہایت خلوص دلچسپی اور محنت سے سیکھا اور پھر اس زبان کو سکھانے کا کام بھی انجام
دیا۔ ان کی نگرانی میں جو کتابیں شائع ہوئیں اِن کو انھوں نے اردو اور دیوناگری دونوں
رسم الخط میں شائع کیا۔ ان کے پیش نظر لسانی حکمت عملی جیسی کوئی چیز نہ تھی۔ ایک وقتی
ضرورت کو محسوس کر کے انھوں نے علمی انداز میں اس کی تکمیل کی۔ انھوں نے تو
دونوں زبانوں کے لیے مشترک اصطلاح ہندوستانی استعمال کی بعد میں خود مہاتما گاندھی
نے اس نقطہ نظر کی تائید کی۔ اگر ان کی بیماری کی ہوئی بات چل نہ سکی تو اس کی ذمہ
داری ان پر کیسے عائد ہوگی۔

جان بارتھوک گل کرسٹ ۱۷۵۹ء میں بمقام ایڈنبرا پیدا ہوئے جیسا کہ بیان
کیا گیا ہے وہیں کے ایک ہسپتال میں طب کی تعلیم حاصل کی۔ ہندوستان آنے سے
قبل کچھ عرصہ جزائر غرب الہند میں بھی گذارے وہاں کامیابی نہ ہوئی تو ۱۷۸۲ء میں جب
کہ ان کی عمر ۲۳ سال کی تھی۔ انھوں نے ہندوستان کا رخ کیا۔ اور بمبئی پہنچے۔ وہ

انگلستان سے بھرتی ہوکر ہندوستان نہیں آئے تھے۔ جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے۔ بلکہ ایک قسمت آزما کی حیثیت سے وہ ہندوستان آئے۔ کرنل چارلس مارٹن نے ان کو ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج میں اسسٹنٹ سرجن کی خدمت پر مامور کیا۔ اور سورت میں تعیناتی ہوئی۔

ہندوستان پہنچتے ہی انھیں زبان کی دقت محسوس ہوئی۔ اور مروجہ زبان نے ان کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ اور انھوں نے اس زبان کو سیکھنا شروع کیا۔ اس روداد کو خود ان کی زبانی سنئے۔

۱۷۸۲ء میں بمبئی وارد ہوتے ہی میں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ ہندوستان میں میرا قیام خواہ اس کی نوعیت جو بھی ہو۔ اس وقت تک نہ تو میرے ہی لئے خوشگوار ہو سکتا ہے اور نہ میرے آقاؤں ہی کے حق میں مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ جب تک کہ اس ملک کی مروجہ زبان میں پوری دست گاہ نہ حاصل کر لوں جہاں عارضی طور پر مجھے قیام کرنا ہے۔ چنانچہ اس زبان کو جسے اس زمانے میں مورس کہتے تھے سیکھنے کے لئے میں جم کر بیٹھ گیا میری اس نئی تعلیم کے سلسلہ میں لوگوں نے جارج ہیڈلے کی اس تالیف کی طرف رجوع کرنے کا مجھے مشورہ دیا جو اس زبان کی مبادیات پر اس نے لکھی تھی۔ ایک دو ہفتوں کے بعد مجھے ایک منشی مل گیا جس نے اصرار کیا کہ ان بزرگ (ہیڈلے) سے میں نے جو کچھ سیکھا تھا۔ اسے سرے سے بھلا دوں کچھ دنوں تک اپنے طور پر کوشش کرنے کے بعد مجھے توقع سے زیادہ کامیابی ہوئی اس بحرانی دور میں خوش قسمتی سے اپنے دوست کپتان جان ربٹ رے سے جواب کرنل ہو چکے ہیں سودا کا کلیات مجھے مل گیا ہندوستانی زبان میں اس وقت

(۱۷۹۶ء) تک جو مہارت میں نے حاصل کی ہے اس کے لئے سوداؔ کے کلیات کا اور اس کریم النفس انسان (جان رٹ رے) کے مشوروں کا نیز اس کی ہمت افزائی و امداد کا میں بے حد رہین منت ہوں "

۱۷۸۳ء میں سورت سے فتح گڑھ تبادلہ ہوا۔ ہندوستانی زبان کے قواعد و لغت پر انگریزی میں کپتان ہیڈلے کی ایک کتاب موجود تھی لیکن جیساکہ اوپر کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ گل کرسٹ نے یہ بات اچھی طرح محسوس کر لی تھی۔ کہ وہ کتاب غیر اطمینان بخش تھی۔ اور بڑھتی ہوئی ضروریات کے لئے کافی نہ تھی۔ اسی بنا پر گل کرسٹ نے خود ایک کتاب لکھنے کا مصمم ارادہ کر لیا اور تین سال کی مختصر مدت میں ہندوستانی زبان پر عبور ہی حاصل نہیں کیا بلکہ اپنی مجوزہ کتاب کے لئے کافی مواد فراہم کر لیا۔

۱۷۸۵ء میں انھوں نے کمپنی کے ساتھ ہندوستانی زبان کے قواعد و لغت کا مزید مواد فراہم کرنے کی غرض سے ایک سال کی رخصت لے لی جس میں سال بہ سال توسیع ہوتی رہی۔ فتح گڑھ سے فیض آباد گئے اور وہیں قیام کیا۔ فتح گڑھ چھوڑنے کے بعد اپنے اصلی پیشہ یعنی طبابت کی طرف وہ کبھی نہ لوٹ سکے۔ یعنی اب وہ طبیب سے ادیب بن چکے تھے۔ اس سال یعنی ۱۷۸۵ء میں لغت کی طباعت کا کام شروع ہوا۔ ۱۷۸۷ء سے ۱۷۹۵ء تک ان کا قیام غازی پور میں رہا۔ اس سات سال قیام کے دوران ان کی پہلی کتاب انگریزی ہندوستانی لغت شائع ہوئی۔ اور یہیں انھوں نے " ہندوستانی زبان کی قواعد " اور " لغت و قواعد کے ضمیمہ " کا مسودہ تیار کیا۔ اس دوران نیل کی کاشت و تجارت کے . . .

زرعی وتجارتی) تجربات میں الجھے رہے۔ اس میں ان کو شدید دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔

۱۷۹۰ء میں لغت چھپ کر تیار ہوگیا۔ ۱۷۹۵ء میں وہ کلکتہ گئے۔ اور ایک سال بعد یعنی ۱۷۹۶ء میں ہندوستانی زبان کی قواعد شائع کی گئی۔ ۱۷۹۸ء میں "لغت وقواعد" کا ضمیمہ اور "مشرقی زبان داں" کی اشاعت عمل میں آئی۔ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ذمہ دار افراد نے گل کرسٹ کو ہندوستانی زبان کا مسلم الثبوت ماہر تسلیم کیا۔

اس اعتراف کے بعد جنوری ۱۷۹۹ء میں گل کرسٹ کے مدرسہ کا قیام عمل میں آیا اس مدرسہ کے لئے مالیہ کا مسئلہ ایک خاص طریقہ پر حل کیا گیا۔ گورنر جنرل کی کونسل کی کارروائی مورخہ ۲۱ دسمبر ۱۷۹۸ء کو لارڈ ولزلی نے جو یادداشت لکھی اس سے اس طریقہ کی وضاحت ہوتی ہے۔ بنگال سول سروس میں بھرتی ہوکر جو نوجوان انگریز ہندوستان آتے۔ ان کو منشی رکھ کر ہندوستانی یا فارسی سیکھنے کے لئے ۳۰ روپیہ ماہوار کا بھتہ دیا جاتا ___ لیکن منشی کی خدمات سے مستفید ہونے کا موقع نہیں ملتا۔

اس کمی کو پورا کرنے کے لئے ہندوستانی قواعد ولغت کے مولف گل کرسٹ نے تجویز پیش کی ہے کہ وہ ہندوستانی اور فارسی زبان کی تعلیم دینے کے لئے روزانہ درس دیا کریں منشی رکھنے کے لئے جو بھتہ دیا جاتا ہے وہ پہلے بارہ مہینوں تک براہ راست گل کرسٹ کو ادا کیا جائے۔ چنانچہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے نووارد ملازمین کو ہندوستانی وفارسی کا درس دینے کے لئے لارڈ ولزلی کے

ایما سے گل کرسٹ نے یہ مدرسہ قائم کیا جو بظاہر نیم سرکاری نوعیت کا ادارہ تھا لیکن عملاً اس کی حیثیت سرکاری درس گاہ کی تھی۔ اور وہ "گل کرسٹ کا مدرسہ" یا "اورنٹیل سیمنری" کہلاتا تھا۔ یہ مدرسہ فورٹ ولیم کالج کا پیش رو تھا۔ اس طرح معلمی کی زندگی کا آغاز ہوا۔ ڈیڑھ سال تک یہ مدرسہ قائم رہا۔ اور ۱۸۰۰ء کے وسط میں برخاست ہوا۔ اس مدرسہ میں طالب علموں کی تعداد ابتداً ۱۳ تھی اور بعد میں ۲۴ تک پہنچی اس مدرسہ میں گل کرسٹ ہی تنہا درس دیتے تھے۔

مئی ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں آیا۔ ۴ مئی ۱۷۹۹ء کو سرنگا پٹنم میں انگریزی فوجوں کو ٹیپو سلطان کے مقابلہ میں کامیابی ہوئی تھی۔ اس کی یادگار کے طور پر یہ کالج قائم کیا گیا تھا۔

۱۰ جولائی کو اس کی باضابطہ داغ بیل ڈالی گئی۔ اور آئین و ضوابط کا مسودہ منظور کر کے اس کو قانونی شکل دی گئی اور لارڈ ولزلی کے حکم سے اس دستاویز پر ۴ مئی کی تاریخ درج کی گئی۔ اور گل کرسٹ کا تقرر ہندوستانی زبان کے پروفیسر کے عہدہ پر عمل میں آیا۔ عام طور پر گل کرسٹ کو فورٹ ولیم کالج کا پرنسپل بتلایا جاتا ہے۔ جو درست نہیں ہے۔ گل کرسٹ کالج کونسل کے رکن بھی تھے۔

۱۸۰۲ء میں گل کرسٹ نے اردو کا پہلا مطبع قائم کیا۔ جو ان ہی کی ملک تھا۔ عام طور پر یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اردو کا پہلا مطبع ۱۸۱۰ء میں قائم ہوا تھا اور یہ کہ اس کے بانی مولوی اکرم علی تھے اس کو محمد عتیق صدیقی نے اپنی کتاب "گل کرسٹ اور اس کا عہد"

میں اصلی ماخذوں کے حوالہ سے غیر درست قرار دیا ہے۔

۱۸۰۰ء سے ۱۸۰۴ء تک گل کرسٹ کی نگرانی میں ۶۳ کتابیں تصنیف تالیف یا ترجمہ کی گئیں اور ۱۲ کتابیں شائع ہوئیں۔گل کرسٹ نے جتنا کام خود کیا ہے اس سے زیادہ دوسروں سے کام لیا۔کالج کے ہندوستانی کے شعبہ کے لئے انھوں نے میر امن۔ بہادر علی حسینی۔ مظہر علی ولا میر بشیر علی افسوس وغیرہ کا انتخاب ہندوستانی منشیوں کی حیثیت سے کیا۔ اس کے علاوہ کالج کے فارسی و عربی شعبوں کے ان منشیوں سے بھی کام لیا۔ جو ہندوستانی زبان میں تصنیف و تالیف کی اہلیت رکھتے تھے۔

۱۸۰۴ء میں گل کرسٹ نے بعذر علالت استعفیٰ دے کر وطن کی راہ لی۔ ہندوستان سے لوٹنے کے بعد ایڈنبرا کی جامعہ نے ان کی علمی خدمات کے اعتراف میں ان کو ال۔ال۔ڈی کی اعزازی سند عطا کی۔

واپسی وطن کے بعد ان کے حالات زندگی کی تفصیل نہیں ملتی۔ ۱۸۴۱ میں بمقام پیرس میں ان کا انتقال ہوا۔

معزز عالم

شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد، اپنی دینی اور ادبی خدمات کی وجہ سے
ایک منفرد اور ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ سرکاری ملازمت کے ساتھ ساتھ انھوں
نے اصلاحی ناولوں کے ذریعہ جو بیش بہا خدمات انجام دیں، وہ اپنی آپ
نظیر ہیں۔ تعزیرات ہند، ضابطہ فوجداری و قانون شہادت کے اردو ترجمے
ایسے شہ کار ہیں جن پر زبان اردو ہی نہیں، فن ترجمہ بھی ناز کر سکتا ہے۔ ان کی
وضع کردہ اصطلاحیں قانونی ادب کا جز بن چکی ہیں۔ ان کے ترجمے میں بیش تر
قانونی اصطلاحات ایسی ہیں جن کو نہ صرف حرف آخر قرار دیا جا سکتا ہے بلکہ اصلی
انگریزی اصطلاحات پر فوقیت دی جا سکتی ہے۔ ٹرانسپورٹیشن فار لائف
Transportation For Life کے ترجمہ حبسِ دوام، بہ عبور دریائے
شور اور ٹریس پاس **Trespass** کے ترجمہ مداخلت بے جا کا شمار ایسی ہی...
اصطلاحات میں ہے۔ پھر قرآن شریف کے بامحاورہ ترجمہ کو لیجئے جو دلی کی ٹکسالی
زبان میں ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس میں ادبیت زیادہ ہے یا مذہبیت۔
حقیقت یہ ہے کہ یہی وہ واحد ترجمہ ہے جس میں آپ کو دونوں چیزیں ملیں گی

جبھی تو اس کو بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی اور جو مخالفت اس ترجمہ کی گئی وہ چھپی نہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد ۱۸۷۷ء میں جب کہ ان کی عمر ۴۴ سال تھی حیدرآباد آئے اس آمد میں علمی شان بھی تھی اور سرکاری اعزاز کی آن بان بھی۔ ہوا یہ کہ انگریز حکمرانوں کا ایک طبقہ ہندوستانی زبانوں میں مغربی علوم کو منتقل کرنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا اور پرخلوص طریقہ پر اس امر کی کوشش کی جارہی تھی کہ ایسی کاوشوں کے لئے ترغیبی انعامات بھی دیئے جائیں۔ چنانچہ لیوپورون کی جانب سے علم ہیئت کی ایک کتاب کے اردو ترجمہ کے لئے ایک ہزار روپے انعام کا اعلان کیا گیا۔ گیارہ ترجمے مقابلہ کے لئے آئے جن میں ڈپٹی نذیر احمد کا ترجمہ بہترین اور انعام کا مستحق قرار پایا۔ یہ ترجمہ تنقید اور نظر ثانی کی غرض سے ریذیڈنٹ حیدرآباد کی وساطت سے مدارالمہام ریاست سر سالار جنگ اور امیر کبیر محمد رفیع الدین خاں شمس الامرائے ثالث (۱۸۰۵ء تا ۱۸۷۷ء) کے پاس بھیجا گیا۔ جن کو علمی ذوق اپنے والد نواب محمد فخرالدین خاں سے ورثہ میں ملا تھا چنانچہ شمس الامراء کے سنگی چھاپہ خانہ میں جو کتابیں طبع ہوئی تھیں وہ زیادہ تر نواب محمد رفیع الدین خاں کی فرمائش اور دلچسپی سے مرتب کی گئی تھیں۔ انھوں نے زیادہ تر علم ہندسہ اور علم حساب پر اردو میں کتابیں لکھوائیں جن کی وجہ سے ان کا نام تمام ہندوستان میں مشہور ہوگیا۔ اردو زبان میں مغربی علوم کی کتابوں کا ترجمہ کرنے کی سب سے پہلی منظم کوشش نواب فخرالدین خاں نے ہی کی تھی۔ دہلی کالج اور سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ کی تحریکیں اس کے بعد کی ہیں[1]۔

---

[1] اردو میں سائنسی ادب از خواجہ حمیدالدین شاہد۔

امیر کبیر اور سر سالار جنگ ہر دو نذیر احمد کی ذہانت اور قابلیت سے بہت متاثر ہوئے۔ سر سالار جنگ ہمیشہ قابل اور لائق افراد کی تلاش میں رہتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے سر سید کے ذریعہ نذیر احمد کی خدمات کو حیدرآباد کے لئے حاصل کرنے کی تحریک کی۔ اس وقت نذیر احمد اعظم گڑھ میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ اس طرح ان کی علمی قابلیت ہی ان کے حیدرآباد آنے کے لئے ذریعہ بنی۔

ڈپٹی نذیر احمد مدبر اور مصلحت بین تھے۔ انگریز سرکار میں ان کو اعلیٰ مقام حاصل تھا۔ ایک ایسی دیسی ریاست میں جس کا حکمران مسلمان ہو ان کو طلب کیا گیا تھا۔ نذیر احمد کی احتیاط پسندی کا تقاضہ تھا کہ وہ اس اعتماد کو متاثر نہ ہونے دیتے جو انگریز سرکار نے ان پر کیا تھا۔ نذیر احمد ان لوگوں میں سے نہ تھے جو طلبی پر دوڑ پڑتے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ حیدرآباد میں ان کی جو مانگ ہوئی اس کے پیچھے خود ان کی کوششوں کو کتنا دخل تھا اور دخل تھا بھی یا نہیں لیکن یہ تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اگر بالفرض انھوں نے بالواسطہ ایسی کوشش بھی کی تھی تو یقیناً ایسے سلیقہ سے کی تھی کہ خود کو ایک امیدوار غرض مند کی حیثیت سے نہیں پیش کروایا بلکہ ایک عالم اور باعزاز شخص کی حیثیت سے۔ چنانچہ جب ان کو سرکاری خدمت کا پیشکش آیا تو اولاً یہ کہہ کر حیدرآباد آنے سے انکار کر دیا کہ میں ایک مضبوط حکومت کو چھوڑ کر ایک کمزور حکومت میں نہیں آتا جب ادھر سے اصرار ہوا تو تنخواہ زیادہ طلب کی۔ قاعدہ کے بموجب اتنی تنخواہ نہیں دی جا سکتی تھی۔

سرور الملک اپنی مشہور و معروف کتاب کارنامہ سروری میں ان اصولوں کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں جن کی پابندی سر سالار جنگ اول نے ... پختہ اور لازم

کرلی تھی "سوائے اعلیٰ عہدہ داران مال جن کا لقب صدر تعلقدار تھا اور کل ریاست میں تنخواہ پانچ سو روپے سے زیادہ نہ کی جائے" چنانچہ طے ہوا کہ نذیر احمد کو صدر تعلقدار کی حیثیت سے لیا جائے۔ لیکن جس تنخواہ کا موصوف مطالبہ کر رہے تھے وہ صدر تعلقدار کے عہدہ کا لحاظ کرتے بھی زیادہ تھی۔ گنجینۂ گوہر میں نذیر احمد کا خاکہ لکھتے ہوئے ان کے پوتر ے شاہد احمد فرماتے ہیں "اس دشواری کو یوں حل کیا گیا کہ نذیر احمد کے ساتھ ان کے دو دامادوں کو بھی اچھی تنخواہوں پر رکھ لیا گیا" اس کے علاوہ حیدرآباد آتے ہی ان کے اکلوتے لڑکے بشیرالدین احمد (پیدائش ۱۸۶۱ء وفات ۱۹۲۶ء) کو بھی نوکری مل گئی جن کی عمر اس وقت ۱۶، ۱۷ سال تھی۔ سوم تعلقداری سے ان کی ملازمت کا آغاز ہوا۔

اس اہتمام کے باوجود نذیر احمد حیدرآباد کی کمزور حکومت سے خائف تھے کہ نہ معلوم شخصی حکومت میں کب کیا ہو۔ جبھی تو انھوں نے مضبوط حکومت میں اپنی نسبتاً کمتر جائیداد سے اپنے تعلق کو باقی رکھا اور احتیاطاً دو سال کی رخصت لے کر ۱۸۷۷ء میں حیدرآباد پہونچے بہ حیثیت صدر تعلقدار ان کی تنخواہ ۱۲۵۰ روپے ماہانہ مقرر ہوئی۔ اس کے بعد ترقی کر کے رکن مجلس مال ہوئے اس وقت ماہانہ تنخواہ (۱۷۰۰) روپے قرار پائی۔ یہ عجیب بات ہے کہ ڈپٹی کلکٹری سے منتقل ہو کر صدر تعلقدار اور رکن مجلس مال بن جانے کے باوجود ڈپٹی کلکٹری نے ان کا ساتھ نہ چھوڑا۔ نذیر احمد ہمیشہ ڈپٹی نذیر احمد ہی کہلائے اور یہ عہدہ گویا ان کے نام کا جز بن گیا جب ڈپٹی نذیر احمد حیدرآباد پہنچے تو فرمانروائے دکن نواب میر محبوب علی خاں تھے اور نواب مختارالملک سر سالار جنگ مدارالمہام

تھے جو بلحاظ کم سنی شاہ دکن ریجنٹ یعنی نائب رئیس بھی تھے اور رشید الدین خاں وقار الامراء اپنے بڑے بھائی امیر کبیر عمدۃ الملک نواب محمد رفیع الدین خاں کے انتقال پر اکتوبر ۱۸۷۷ء میں شریک نائب رئیس مقرر ہوتے تھے ۔

سر سالار جنگ اعلیٰ درجہ کے ماہر نظم ونسق تھے وہ قابلیت کی قدر کرنا جانتے تھے ۔ نذیر احمد کی بھی انھوں نے بے حد قدر و منزلت کی اور اپنے دونوں فرزندوں، میر سعادت خاں منیر الملک اور میر لائق علی خاں سالار جنگ ثانی کو ان کی شاگردی میں دے دیا ۔ جب نذیر احمد، حیدر آباد آئے تو اس وقت نظام حیدر آباد میر محبوب علی خاں کی عمر دس سال کی تھی ۔ سر سالار جنگ نے نذیر احمد سے نظام دکن کی تعلیم کے لئے انتظام مملکت پر رسالے لکھنے کی فرمائش کی موصوف نے سات رسالے لکھ کر پیش کئے ۔ یہ رسالے شائع نہیں ہوئے ۔ اس بارے میں سرور الملک فرماتے ہیں "اور نذیر احمد نے خوش خط قلمی رسالے اصلاحات صیغہ مال ضوابط مالگذاری صاف سیدھے اردو زبان میں خود تالیف کر کے کپتان دکلاڈ کلارک) صاحب کو دیتے " بس اس حد تک نذیر احمد کو نظام دکن کی معلمی کا فخر حاصل ہوا ۔ اس امر کی کوشش کی گئی تھی کہ مولوی نذیر احمد کو شاہی اتالیق کی حیثیت سے مقرر کیا جائے ۔ سرور الملک کارنامہ سروری میں لکھتے ہیں ۔ اس کے بعد مولوی نذیر احمد نے کپتان صاحب (کلاڈ کلارک کے برادر بزرگ کپتان جان کلارک) سے راہ و رسم پیدا کی ۔ یہ صاحب دلی کے قریب کے قصبہ کے رہنے والے انگریزی سرکار میں سررشتہ تعلیم کے اعلیٰ عہدہ دار صاحب تصنیف پنشن لے کر حیدر آباد میں بہ عہدہ صدر تعلقداری سرفراز تھے

سن رسیدہ، نہایت چست و چالاک، کپتان صاحب کو بہت جلد گوندے پر لگایا اور یہ قرار پایا کہ انگریزی کے ساتھ ملکی انتظام کی بھی تعلیم دی جاتے۔ ادھر ریذیڈنٹ کو خود وزارت پناہ پر بہتر اعتمادات تھے اور مولوی نذیر احمد صاحب علامہ دہر، سرکار انگریزی کے پنشن یافتہ قابل اعتماد وہ بھی ہم رائے کپتان کلارک کلارک ہوا اور خواہ مخواہ امیر کبیر کو بھی ہم رائے ریذیڈنٹ ہونا پڑا۔ گو حق بات یہ ہے کہ شاہ پور جی نے نہایت کوشش کی کہ ریذیڈنٹ کی رائے کو بدلے۔ وزارت پناہ کو بہ مجبوری یہ تقرر منظور کرنا پڑا اور میں جب حسب معمول ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو بکمال شفقت میرے آنسو پونچھنے کے واسطے ارشاد فرمایا کہ مولوی (نذیر احمد) کا تقرر تو ہو گیا مگر آپ (سرور الملک) کا کوئی نقصان نہ ہوگا۔ کلارک صاحب اوقات درس تقسیم کر دیں گے۔ ادھر کپتان صاحب نے مجھ سے کہا کہ کل مولوی (نذیر احمد) صاحب اپنا کام شروع کر دیں گے۔ مولوی (نذیر احمد) صاحب کے ہاں یہ حال تھا کہ تقرر سے ایک روز قبل ہی تمام خاصات دیوڑھی مبارک کو نام بنام اپنے رشتہ داروں اور ہوا خواہوں میں بانٹ چکے تھے اور ہوا یہ کہ ایک دربار عظیم الشان ان کے ہاں قائم ہو گیا۔ میں کپتان کلارک اور مولوی نذیر احمد کا انتظار کرتا رہا مگر وہ دونوں صاحب نہ آئے۔ بعد تناول خاصہ مستحکم جنگ نے مجھ سے کہا کہ مولوی مسیح الزماں خاں تو دنیا کی ماں تھے۔ اب دنیا کا باپ آتا ہے مگر تعجب ہے کہ اب تک نہیں آیا۔ میں بھی دریائے حیرت میں غرق کپتان کے پاس پہنچا۔ وہ غیض غضب کی حالت میں پریشان حال مجھ سے ملتے ہی بولے امیر کبیر (نواب رشید الدین خاں وقار الامراء) نے مجھ کو بڑا دھوکہ دیا اور عالم خلائق میں مجھ کو رسوا کیا۔ یہ خط وزیر اعظم کا پڑھو اس میں لکھا تھا نواب امیر کبیر بہادر

نے تقرر مولوی نذیر احمد کا نامنظور فرمایا۔ آپ ان کو ڈیوڑھی مبارک میں نہ لے جائیے۔ اس کے بعد کلاڈ کلارک نے مجھ سے کہا "میں ریذیڈنٹ کے پاس بھی گیا تھا۔ کل تک وہ میرے مدد و معاون تھے۔ آج مجھی پر پلٹ پڑے اور کہا کہ تم لوگ آپس میں لڑکر مجھ کو ستاتے ہو۔ کیا ضرورت ہے کہ ایک پردیسی آدمی خلاف مرضی امیر کبیر بہادر ڈیوڑھی مبارک میں مقرر کیا جائے"۔ لہذا یہ میرا استعفیٰ نواب صاحب کو لے جاکر دے دو اور کہہ دو کہ اگر نذیر احمد ڈیوڑھی میں نہ آئے تو میں بھی خدمت سے دستبردار ہوں۔ مگر ان کے اصرار سے میں (سرور الملک) مجبوراً نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ نواب صاحب نہایت خندہ پیشانی سے ملے اور فرمایا۔ "رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت مگر نواب امیر کبیر بہادر کو یہ حرکت زیبا نہ تھی اور کلارک صاحب کی بھی یہ ہٹ اور ضد ناحق ہے۔ کل تک تو عبد المجید کا وکیل میرے پاس آیا اور کہا کہ نواب صاحب فرماتے ہیں کہ اگر نذیر احمد صبح کو ڈیوڑھی میں گیا تو میں شہر چھوڑ کر باہر نکل جاؤں گا۔ اس کے بعد سر رچرڈ ٹیمپل کا خط آیا کہ نذیر احمد ڈیوڑھی میں نہ جانے پائے" غرض مولوی نذیر احمد ڈیوڑھی نہ پہونچ سکے اور نظام دکن کو آپ کی شاگردی کا شرف حاصل نہ ہو سکا۔

قدیم ریاست حیدر آباد تین علاقوں تلنگانہ، مرہٹواڑہ اور کرناٹک پر مشتمل تھی۔ ——— اس کے ملازمین سر رشتہ مال کو تلنگی، مرہٹی یا کنڑی میں سے کسی ایک زبان سے واقفیت حاصل کرنا ضروری تھا۔ ہر چند کہ اعلیٰ عہدہ داروں اور خصوصاً باہر سے آئے ہوتے عہدہ داروں کے لئے ملکی زبان سے واقفیت ناگزیر نہ تھی لیکن مولوی نذیر احمد نے حیدر آباد کے قیام کے دوران تلنگی زبان سیکھی۔

اسی طرح ایک طویل دورے کے دوران قرآن مجید حفظ کرلیا۔

حیدرآباد میں آپ کے آٹھ سالہ قیام کا زمانہ کچھ ایسی مصروفیات سرکاری میں گزرا کہ موصوف تصنیف وتالیف کے لئے وقت نہ نکال سکے۔ لیکن ایسا کہنا صدفیصد درست نہ ہوگا جس شخص کو لکھنے پڑھنے کے کام سے دلچسپی ہو اس کا ذہن ہمیشہ کام کرتا رہتا ہے۔ گو دکن کے قیام کے زمانہ میں سرکاری مصروفیات کی وجہ سے مولوی نذیر احمد کی کوئی تصنیف یا تالیف منظر عام پر نہ آسکی۔ لیکن حیدرآباد سے واپس جانے کے بعد جو کام تکمیل پائے۔ مثلاً فسانہ مبتلا ابن الوقت رویائے صادقہ ایامی... یا پھر اردو ترجمہ قرآن مجید اور الحقوق والفرائض ان کے تعلق سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان شہ پاروں کے خاکے، دوران قیام حیدرآباد ہی مرتب ہوتے ہوں گے۔

سرسالار جنگ کا انتقال ۱۸۸۳ء میں ہوا آپ کے فرزند سالار جنگ ثانی صدر المہام مقرر ہوئے۔ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے سالار جنگ ثانی کو مولوی نذیر احمد کی شاگردی کا شرف حاصل رہا تھا۔ لوگوں کو کھٹکا پیدا ہوا کہ کہیں مولوی نذیر احمد بہ حیثیت استاد ہونے کے اپنے شاگرد پر اثر نہ ڈالیں۔ لگائی بجھائی ہونے لگی دوسرے یہ کہ سرسالار جنگ مولوی نذیر احمد کی حمایت کرتے تھے، وہ ایک مضبوط اور دانشمند آدمی تھے۔ ان کے فرزند جو ان کے بعد مدار المہام ہوتے تھے ان میں وہ بات نہ تھی۔ غرض دکن کی سیاسی فضا مولوی نذیر احمد کے لئے ناسازگار تھی۔ ۱۸۸۵ء میں ملازمت کی مدت بھی پوری ہو رہی تھی چنانچہ پنشن لے کر دہلی چلے گئے اور اس طرح حیدرآباد میں ان کے قیام کا آٹھ سالہ دور اختتام کو پہنچا۔

شاہد احمد کا یہ کہنا کہ نذیر احمد کو زمانہ سازی بالکل نہیں آتی تھی۔ صرف جزوی طور پر درست کہا جاسکتا ہے۔ اگر ان کو زمانہ سازی نہ آتی تو وہ انگریزی سرکار میں اعزاز نہ پاتے اور ایک کامیاب عہدہ دار قرار نہ پاتے۔ ہاں یہ بات صحیح ہو سکتی ہے کہ حیدرآباد میں سرسالار جنگ کے بعد جو سیاسی حالات پیدا ہوتے ان سے وہ نباہ نہ کر سکے۔

مردِ دانا

سید جمال الدین افغانی کا شمار بڑے مشاہیرِ اسلام میں کیا جاتا ہے۔ انھوں نے انیسویں صدی کے نصف آخر میں جب کہ دنیائے اسلام منتہائے ذلت کو پہنچ چکی تھی مسلمانوں کے تخیل میں تبدیلی پیدا کرنے اور ان میں احساس برتری پیدا کرنے کی کوشش کی انھوں نے اسلامی اخوت کو اسی انداز میں جیسا کہ ابتدائے اسلام میں تھا پیدا کرنے کی کوشش کی اور مسلمانوں میں قومی درد پیدا کیا۔ اور اسلام کی شیرازہ بندی کے لئے اپنی ساری عمر جدوجہد کی۔ انھوں نے ان مسائل کے لئے اپنی ساری زندگی کو بالکل وقف کر دیا۔ اور خود کو ان مسائل سے ایسا وابستہ کر دیا کہ ان کا نام جب تک کہ دنیا میں مسلمان باقی ہیں باقی رہے گا۔

سید جمال الدین افغانی نے اپنی زندگی میں خود کو کسی تحریک سے وابستہ نہیں اور نہ انھوں نے کسی تحریک کی ابتدا کی۔ لیکن وہ ایسی زبردست اور حیرت انگیز شخصیت کے مالک تھے۔ اتنی وسعت نظر اور بصیرت رکھتے تھے کہ انھوں نے تمام مسلمانوں کی آزادی اور ان کے باہمی اتحاد کی تحریک کو دنیائے اسلام میں پھیلا دیا۔ اور دنیائے اسلام پر ایسا گہرا اثر ڈالا کہ آئندہ بیس سال تک دنیائے اسلام میں جن تحریکات

نے جنم لیا ان پر جمال الدین افغانی کی پیدا کی ہوئی بیداری کا اثر نمایاں رہا۔

چوں کہ ہم اپنے بڑے آدمیوں کی حقیقی عظمت کو نہیں پہچانتے جب تک کہ مغرب ان کی عظمت کو تسلیم کر کے واقف نہ کرائے۔ اس لیے جمال الدین افغانی سے متعلق مشہور فرانسیسی مستشرق ارنسٹ رینان کا بیان قابل توجہ ہے۔ اس تحریہ کو جمال الدین افغانی پر ایک مضمون میں مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی استعمال کیا ہے۔

"تقریباً دو ماہ ہوئے کہ ایک شخص جمال الدین سے میری ملاقات ہوئی۔ اس شخص کی شخصیت کا میرے دماغ پر جو اثر پڑا وہ ایسا ہے جو بہت کم شخصیتیں مجھ پر ڈال سکی ہیں۔ یہ اثر بہت قوی اور گہرا تھا۔ اور اسی کا نتیجہ ہے کہ مجھے خیال ہوا کہ سوربورن یونیورسٹی کے خطبات کا یہ موضوع قرار دوں "اسلام اور اس کا علم سے علاقہ" سید جمال الدین افغانی کی ذہنیت ایک ایسی ذہنیت ہے جو رسمی اسلام کے مضر اثرات کی پوری طرح مقاومت کر سکتی ہے۔ میں جب اس شخص سے باتیں کر رہا تھا تو اس کے افکار کی عظمت آزادیٔ فکر کی فضیلت اور اظہار حقیقت کی جرأت دیکھ کر مجھے خیال ہوا کہ میں اس وقت ان مشاہیر عالم میں سے کسی ایک سے مخاطب ہوں جو دنیا کے گزشتہ علمی زمانوں میں گذر چکے ہیں۔ اور جن سے تاریخ کے ذریعہ ہم نے واقفیت حاصل کی ہے۔ میں گویا ابن سینا ابن رشد یا ان حکمائے عظام میں سے کسی حکیم کو اپنے سامنے دیکھ رہا تھا جنھوں نے فکر انسانی کو جہل و اوہام کے قیود سے نجات کے لئے تاریخ عالم کی پانچ صدیوں تک اپنی شجاعانہ جدوجہد جاری رکھی۔"

سید جمال الدین افغانی ۱۸۳۶ء میں پیدا ہوئے۔ مقام پیدائش کی حد تک اختلاف ہے۔ بعض کا بیان ہے کہ وہ افغانستان کے ایک مقام کنڑ میں پیدا ہوئے اور بعض کا خیال

ہے کہ ایران کے اسد آباد میں پیدا ہوئے۔ قاضی محمد عبدالغفار صاحب نے اپنی کتاب آثار جمال الدین افغانی میں اس سلسلے پر کافی بحث کرنے کے بعد اول الذکر مقام ہی کی جانب اپنا رجحان ظاہر کیا ہے۔ ان کے والد کا نام سید صفدر تھا۔ بچپن ہی میں یہ اپنے والد کے ساتھ کابل گئے اور ان کے والد نے اپنی نگرانی میں ان کی تعلیم کا انتظام کیا۔ جب یہ اٹھارہ سال کے ہوئے تو پہلی مرتبہ ہندوستان آئے اور ایک سال چند ماہ قیام فرمایا اس دوران میں انگریزی پڑھی اور مغربی فلسفہ اور سائنس کا مطالعہ کیا، ۱۸۵۷ء میں حج کیا اور کابل واپس ہوئے۔ انھوں نے حج کے موقع پر تجویز پیش کی کہ اسلامی ممالک اپنے اپنے ملکی معاملات میں آزاد رہیں اور اپنے اپنے مناسب حال اسباب ترقی تلاش کریں لیکن اتفاق و یکجہتی کے ساتھ ایک خلیفہ کی اطاعت قبول کریں۔ اسلامی ممالک کے جس قدر سربرآوردہ لوگ حج میں شریک تھے سب نے اس تجویز سے اتفاق کیا۔

کابل واپس ہوکر سید صاحب امیر دوست محمد خاں کے ساتھ رہے ہرات کی مہم میں بھی ان کے ہمراہ تھے۔ امیر کے انتقال کے بعد امیر شیر علی خاں نے اپنے تینوں بھائیوں کو گرفتار کرلینا چاہا۔ سید صاحب انکے ایک بھائی محمد اعظم کے ساتھ ہوگئے۔ محمد اعظم اور ان کے نامور بھتیجے عبدالرحمٰن خاں نے کابل پر قبضہ کرلیا۔ عبدالرحمٰن کے والد سردار محمد افضل خاں قید سے آزاد کرکے امیر بنائے گئے وزارت سید صاحب کے سپرد ہوئی۔ امیر نے سید صاحب کے مشورہ پر عمل نہ کیا اور شیر علی نے موقع پاکر قندھار پر قبضہ کرلیا۔ انگریزوں نے عین وقت پر ان کی مدد کی محمد اعظم نیشاپور بھاگ آئے عبدالرحمٰن نے بخارا میں پناہ لی۔ سید صاحب نے قبائلیوں پر اپنا اثر قائم کرلیا تھا اس لئے محفوظ رہے انھوں نے حج و زیارت کی اجازت لی اور ہندوستان چلے آئے۔ انگریزوں کو امیر شیر علی خاں کی خوشنودی منظور تھی

جو یہ چاہتے تھے کہ سید صاحب محمد اعظم سے کوئی تعلق نہ رکھیں چنانچہ حکومت ہند نے ان کو اپنا مہمان بنایا اور یہ شرط رکھی کہ تقریر و تحریر سے پرہیز اور ایک سرکاری نمائندہ کو اپنے ساتھ رکھیں۔ اس کے بعد حکومت ہند نے سید صاحب کو سرکاری جہاز میں سوئز روانہ کر دیا۔ سید صاحب حج کا ارادہ ترک کر کے قاہرہ گئے اور (۴۰) روز قیام کیا جامع ازہر کے اساتذہ اور طلباء نے انھیں ٹھہرالیا اور سید صاحب نے اس مختصر قیام میں ایسے انقلابی حالات پیدا کئے جو بعد میں اعرابی پاشا اور سوڈانی مہدی کی بیداری کا باعث ہوئے۔

اس کے بعد سید صاحب استنبول گئے وہاں خاموشی سے کام کرنا چاہتے تھے لیکن رئیس دارالفنون کے اصرار پر جامعہ میں بزبان ترکی لکچر دیا جس سے شہر میں دھوم مچ گئی حسن فہمی افندی شیخ الاسلام نے لکچر کے ایک جزو پر اعتراض کیا کہ انھوں نے منصب رسالت کو سیاسی گورکھ دھندہ اور رسول کو سیاسی شاطر بتلایا ہے اس اختلاف نے ایک فتنہ کی صورت اختیار کر لی خلیفہ نے اس صورت حال کو دیکھ کر بہ نظر مصلحت کچھ عرصہ کے لئے آپ کو استنبول سے باہر جانے کی ہدایت کی۔ سید صاحب مارچ ۱۸۷۱ء میں مصر کو واپس ہوتے وہاں ریاض پاشا کی توجہ سے جو وزارت کے عہدہ پر فائز تھے ان کو وظیفہ جاری ہو گیا۔ اب سید صاحب ہر روز جامعہ ازہر میں یا پھر اپنے مکان پر علمی مباحثے کرنے لگے اور طلباء کو علوم کے حصول اور جدید امور سیاسی میں حصہ لینے کی ترغیب دیتے تھے۔ برٹش قونصل جنرل نے اس آثار بیداری سے پریشان ہو کر آپ کو مصر سے خارج کر دیا ستمبر ۱۸۷۹ء میں آپ مصر سے حیدرآباد آئے اور یہاں کے ایک امیر رسول یار جنگ کے پاس قیام کیا۔ حیدرآباد میں مختار الملک کا دور تھا

جو ہندوستان کے حالات اور غدر کے ظالمانہ ردعمل سے خوف کھا کر ریاست کی خیر منا رہے تھے۔ شمالی ہند میں آزادہند کے اولین رہبر وہابیوں پر انگریزی حکومت کی جانب سے سخت تشدد شروع ہو چکا تھا اور وہ پوشیدہ طور پر حیدرآباد میں پناہ لینے لگے تھے۔ حیدرآباد میں سید صاحب کا اثر قبول کیا جانے لگا تھا جن لوگوں نے ان کے اثر کو قبول کیا ان میں مولوی محمد اکبر تھے جو اچھے مقرر تھے۔ بلدہ میں بیداری کے آثار دیکھ کر سالار جنگ کی پریشانی بڑھ گئی کہ اس کی وجہ سے کوئی ردعمل نہ ہو جس سے ریاست کو نقصان پہنچے۔ سید صاحب نے سالار جنگ کی مخالفت شروع کر دی لیکن سالار جنگ نے بہ کمال دور اندیشی اور جاگیرداریت کے اثر کے تحت مسلمانوں کی پست ذہنیت سے فائدہ اٹھا کر سید صاحب کے اثر کو مذاق بنا کر زائل کر دیا۔ جہاں سید صاحب یا ان کے پیرو جاتے چھوٹے چھوٹے لڑکے ان کے پیچھے آوازے کستے۔

اس دور میں مصر میں سید صاحب کا اثر رنگ لایا خدیو مصر توفیق پاشا نے انگریزوں اور فرانسیسیوں سے مدد طلب کی۔ فرانسیسیوں نے مداخلت سے انکار کر دیا کیوں کہ اس وقت تک مصر سلطنت عثمانیہ کا صوبہ تھا البتہ انگریزوں نے مداخلت کی اور مصر کی بغاوت کو فرو کیا۔ اعرابی پاشا سیلون میں قید کئے گئے اور شیخ محمد عبدہٗ جو مصر کے مفتی اعظم تھے معزول اور جلاوطن کئے گئے۔ انگریزوں نے مصر کی بغاوت فرو ہونے تک سید صاحب کو حیدرآباد سے کلکتہ منتقل کر کے وہاں ایک طرح نظربند رکھا۔ کلکتہ سے چھوٹنے کے بعد سید صاحب امریکہ اور پھر لندن گئے وہاں سے پیرس گئے اور تین سال قیام کیا۔ شیخ محمد عبدہٗ بھی اس وقت پیرس ہی میں تھے۔ دونوں نے مل کر ایک اخبار جاری کیا جس میں انگریزوں کے خلاف مضامین شائع کئے اس سے تمام یورپ میں

ایک تہلکہ مچ گیا۔ سید صاحب پیرس سے پھر لندن گئے۔ جب سید صاحب کا جاری کیا ہوا اخبار بند ہوا تو سید صاحب روس گئے اور وہاں تقریباً ۴ سال ٹھہرے۔ ۱۸۸۶ء میں سید صاحب ناصرالدین شاہ قاچار کی طلبی پر ایران گئے۔ وزارتِ جنگ ان کے تفویض ہوئی لیکن چند ہی روز میں روس واپس ہو گئے۔ جب شاہ ایران روس گئے تو سید صاحب سے ملنے کی بہتیری کوشش کی لیکن سید صاحب نے گریز کیا۔ اس کے بعد میونک میں دونوں ملے۔ شاہ نے مکرر ایران آنے پر اصرار کیا چنانچہ سید صاحب شاہ کے ساتھ اس توقع پر ایران گئے کہ اس ملک کی کچھ اصلاح کر سکیں وزارتِ عظمیٰ ان کے تفویض ہوئی شاہ نے ابتداً جن اصولوں کو تسلیم کر لیا تھا ان سے روگردانی شروع کی۔ سید صاحب نے استعفیٰ پیش کیا اور ایران سے رخصت ہونا چاہتے تھے۔ شاہ نے اجازت نہ دی جب سید صاحب کو جان کا خوف ہوا تو عبدالعظیم کی درگاہ میں پناہ لی اور شاہ کی مخالفت شروع کر دی۔ شاہ نے عمل درآمد کے خلاف درگاہ کی حرمت کا خیال کئے بغیر ایک فوجی دستہ بھیج کر سید صاحب کو بہ جبر ایران کی سرحد کے باہر کر دیا۔ ۱۸۹۱ء میں سید صاحب مکرر انگلستان گئے۔ ۱۸۹۲ء میں استنبول گئے جہاں آپ خلیفہ کے مہمان تھے۔ خلیفہ نے کہا کہ شاہ ایران خوف زدہ ہو رہے ہیں ان کی مخالفت سے باز آؤ۔ سید صاحب نے کہا کہ میں نے شاہ کو معاف کیا۔ ۱۸۹۶ء میں محمد رضا کرمانی نے ناصرالدین شاہ قاچار کو ریوالور سے قتل کر دیا تو اس قتل کا الزام سید صاحب پر عاید کر کے حکومتِ ایران نے خلیفہ سے مطالبہ کیا کہ وہ سید صاحب اور دیگر چند اشخاص کو ان کے حوالہ کر دیں۔ خلیفہ نے سید صاحب کی حد تک مطالبہ کو نامنظور کیا۔ لیکن سید صاحب کو گرفتار رکھا۔ مارچ ۱۸۹۷ء میں سید صاحب نے استنبول میں وفات پائی۔ انتقال کے وقت آپ کی عمر (۵۹)

سال کی تھی۔

سید صاحب کے ایک خط سے جو انھوں نے اپنے ایک ایرانی دوست کو لکھا ہے اور جو ان کا آخری خط قرار دیا جاتا ہے ان کی زندگی کے مقصد اور کارناموں پر روشنی پڑتی ہے۔ اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کیسی نظر اور کیسے ارادے رکھتے تھے اور ان کے جذبات و افکار کیا تھے خط کا اقتباس درج ذیل ہے۔

میں اس وقت یہ خط اپنے ایک عزیز دوست کو لکھ رہا ہوں اس حال میں لکھ رہا ہوں کہ حبس میں مقید ہوں اور اپنے دوستوں کی ملاقات سے محروم نہ مجھے نجات کا انتظار ہے نہ زندگی کی امید۔ نہ گرفتاری سے ملول ہوں اور نہ مارے جانے سے متوحش۔ خوش ہوں اپنی گرفتاری سے، خوش ہوں اپنے مارے جانے سے میرا جسم مقید ہے آزادی نوع انسانی کے لئے میں مارا جاتا ہوں قوم کی زندگی کے لئے۔

لیکن افسوس ہے تو اس کا کہ اپنی بوئی ہوئی کھیتی کو سرسبز دیکھنے کی جو آرزو رکھتا تھا وہ پوری ہوتی دکھائی نہیں دیتی شمشیر شقاوت نے موقع نہ دیا کہ مشرق کی قوموں کی بیداری کا نظارہ کرتا۔ دست جہالت نے فرصت نہ دی کہ امم مشرق کے حلق سے نکلنے والی صدائے آزادی سنتا۔

اے کاش میں نے اپنے افکار کے سارے تخم ملت کے زرخیز مزرعہ میں بوئے ہوتے۔ کیا ہی اچھا ہوتا۔ کہ میں نے اپنے بار آور تخم سلطنت کے شورہ زار میں نہ ڈالے ہوتے جو کچھ مزرعہ میں نے بویا اس میں نمو ہوتے دیکھا۔ جو کچھ اس بنجر زمین میں ڈالا بے کار گیا۔ اس مدت میں میری ساری خیرخواہانہ زحمتیں سلاطین مشرق کے کانوں تک نہ پہنچیں۔ سب کی شہوت وجہالت نے ان کو قبول نہ کرنے دیا۔

اب میں اپنے عزیز دوست سے خواہش کرتا ہوں کہ وہ میرے اس آخری خط کو میرے عزیز دوستوں اور ہم مسلک ایرانیوں تک پہنچا دیں۔ سلاطین کے حرکات مذبوحی سے نہ گھبرانا۔ نہایت سرعت کے ساتھ اس کی اصلاحی کوشش کئے جاؤ۔ فطرت تمہارے ساتھ ہے اور خالق فطرت تمہارا مددگار۔ تجدد کا سیل تیزی کے ساتھ مشرق کی طرف رواں ہے مطلق العنان حکومت کا خاتمہ ہونے والا ہے تمہیں چاہئے کہ مطلق العنان حکومت کی بنیادی خرابیوں کی اصلاح کرو نہ کہ اشخاص کا قلع قمع۔"

✤ ✤ ✤

یوں جیتے ہیں

۱۸۶۳ء میں سرسید کی مشہور کتاب تبیین الکلام شائع ہوئی تو قدامت پسند علماء میں اس کے خلاف سخت ردعمل ہوا۔ یوں تو سرسید کے پاس اس سلسلہ میں مخالفین اور معترضین کے بیسیوں خطوط آتے رہتے تھے لیکن ایک ۲۶ سالہ نوجوان تحصیلدار کے خط نے جو بغیر کسی تعارف کے لکھا گیا تھا اور جس میں سرسید کے عقائد پر سخت حملے کرتے ہوئے انھیں تقریباً کافر و ملحد قرار دیا گیا تھا انھیں چونکا دیا۔ سرسید بڑے آدمی نہ ہوتے اگر انھوں نے اس نوجوان کے خط سے بے اعتنائی کی ہوتی یا اس کا سخت جواب دیا ہوتا۔ انھوں نے نہایت سلجھے ہوئے انداز میں جواب دیا اور پھر دو چار ملاقاتوں میں سرسید کی شخصیت اور خلوص کے جادو نے اپنا وہ اثر دکھایا کہ عمر بھر مہدی علی سرسید اور ان کی تحریک کے زبردست موئید اور پشت و پناہ بنے رہے اور اس سلسلہ میں انھوں نے جو کچھ بھی کیا وہ علیحدہ تفصیل کا محتاج ہے۔ مہدی علی نے قوم کی خدمت بھی کی اور حکومت بھی کی۔ قوم سے بھی اعزاز پائے اور حکومت سے بھی۔ لیکن خود سرسید کا تہذیب الاخلاق میں ان کے متعلق یہ لکھنا۔

"مولوی مہدی علی کا علم۔ اس کی فصیح تقریر اس قابل ہیں کہ اگر ہماری قوم کے

دل کی آنکھیں اندھی نہ ہوتیں تو اس کے نام پر فخر کیا کرتے "

اور ان کی وفات پر مولانا حالی کا ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کرنا۔

جو قوم کی دوستی کا دم بھرتے ھیں
خدمت پہ وطن کی ناز جو کرتے ہیں
مہدی سے وہ سیکھ لیں کہ اس کوچے میں
یوں رہتے ہیں یوں جیتے ہیں یوں مرتے ہیں

ایسے اعزاز ہیں کہ کوئی اور اعزاز ان سے زیادہ قابل فخر نہیں ہو سکتا۔

مہدی علی خاں کی زندگی کے چار دور قائم کئے جا سکتے ہیں۔

۱۔ ابتدائی دور بشمول زمانہ طالب علمی	۱۸ رسال (۱۸۳۷ء تا ۱۸۵۵ء)
۲۔ ملازمت برطانوی ہند	۱۹ رسال (۱۸۵۵ء تا ۱۸۷۴ء)
۳۔ قیام حیدر آباد	۱۹ رسال (۱۸۷۴ء تا ۱۸۹۳ء)
۴۔ آخری دور	۱۴ رسال (۱۸۹۳ء تا ۱۹۰۷ء)

یہاں ہم مہدی علی خاں کے قیام حیدر آباد کے دور پر بحث کریں گے لیکن پہلے دو ادوار پر سرسری نظر ڈالنا بیجا نہ ہوگا۔

مہدی علی خاں اٹاوہ کے ایک معزز خاندان سادات سے تھے جو سادات بارہہ کے خاندان کی ایک شاخ ہے وہ ۹ رڈسمبر ۱۸۳۷ء کو بمقام اٹاوہ پیدا ہوئے۔

ابتدائی تعلیم خانگی مکتب میں شروع ہوئی۔ اس ہونہار طالب علم نے ذہانت ذکاوت کے ساتھ تعلیمی مراحل طے کئے۔ انگریزی تعلیم کا رواج نہ تھا اور نہ سہولتیں مہیا تھیں اس لئے اس سے بے بہرہ رہے۔

ختم تعلیم کے بعد اٹاوہ کی کلکٹری میں دس روپیہ ماہوار کی محرری پر تقرر ہوا چند سال بعد مسٹر ایلن ہیوم کلکٹر اٹاوہ نے محررسے اہلمد کر دیا۔ پھر عہدہ پیش کاری حاصل ہوا ڈیڑھ سال بعد سررشتہ داری کی خدمت پر تقرر ہوا اس کے دو سال بعد ۱۸۶۱ء میں تحصیلداری پر تقرر عمل میں آیا۔

بحیثیت تحصیل دار انھوں نے اپنی انتظامی صلاحیتوں کا ثبوت دیا و نیز صیغہ مال و فوجداری کے متعلق مفید و کارآمد رسالے زبان اردو میں تالیف کئے۔ ۱۸۶۷ء میں مرزاپور کے ڈپٹی کلکٹر مقرر ہوئے جہاں دو تعلقوں کے کورٹ آف وارڈز کی منیجری کے فرائض بھی انجام دینے پڑے۔ ان کی صلاحیتوں کا اعتراف مسٹر بالک کلکٹر ضلع نے یوں کیا "میں دعویٰ کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مہدی علی سے زیادہ مستعد اور ایماندار کوئی ملازم صوبہ ممالک مغربی و مشرقی میں نہیں ہے"

۱۸۷۴ء میں جب کہ ان کی عمر ۳۷ سال کی تھی سر سید احمد خاں کی سفارش پر سر سالار جنگ اول نے ان کو ریاست حیدرآباد میں سرکاری ملازمت کا پیش کش کیا چنانچہ وہ خدمت ڈپٹی کلکٹری سے مستعفی ہو کر حیدرآباد آئے۔ (نواب عماد الملک ۱۸۷۳ء میں مشتاق حسین وقار الملک ۱۸۷۵ء میں۔ مولوی چراغ علی اعظم یار جنگ اور ڈپٹی نذیر احمد ۱۸۷۷ء میں حیدرآباد آئے)

حیدرآباد آنے کے بعد ابتداً صدر محاسبی کی تنظیم کا کام موصوف کے تفویض ہوا اور بیشتر وقت ریاست کی مالی حالت دریافت کرنے پر صرف ہوا۔ ریاست کا بجٹ آپ نے مرتب کیا۔ یہ بجٹ مصر کے بجٹ کے نمونہ پر تھا جو وہاں انگریزی نگرانی کے بعد پہلی مرتبہ مرتب ہوا تھا۔

دو سال بعد ۱۸۷۶ء میں آپ کا تقرر معتمدی مال پر عمل میں آیا اس حیثیت سے آپ نے ریاست میں سروے اور بندوبست کے کام کو انجام دلوایا۔ حیدرآباد کا محکمہ بندوبست ان ہی کا قائم کیا ہوا ہے۔ ریاست کی آمدنی کو منصفانہ شرح مال گذاری قائم کرکے محفوظ کیا لیکن ساتھ ہی ساتھ رعایا کو بھی حقوق دلائے اور سان کو ترقی زراعت کی جانب پورا مائل کر دیا۔ آپ نے سروے اور بندوبست کی ایک مبسوط رپورٹ بھی مرتب کی جس کے متعلق سر ولیم میور نے لکھا۔

"جب میں نے آپ کے تبادلہ حیدرآباد کی خبر سنی تو اسی وقت آپ کی ذہانت و قابلیت کا جو تجربہ تھا اس کی بنا پر مجھے یقین ہو گیا تھا کہ آپ اس دائرہ میں ممتاز ہوں گے۔"

انتظام مالگزاری کے لئے آپ نے محنت و جانفشانی سے اصول اور مبادیات قائم کئے اور اگر یہ کہا جائے کہ ریاست حیدرآباد کا نظام مال گزاری ان ہی کی وضع کردہ بنیادوں پر قائم رہا تو غلط نہ ہوگا۔ اس اہم اور بنیادی کام میں آپ کو شمس العلماء نواب عزیز جنگ ولا جیسے واقف کار اور تجربہ کار عہدہ داران مال کا تعاون حاصل رہا۔

۱۸۷۷ء میں ریاست حیدرآباد میں سخت قحط پڑا۔ سر سالار جنگ نے آپ کو قحط کمشنر مقرر کیا۔ اور آپ نے اس خدمت کو کامیاب طریقہ پر سرانجام دیا اور موثر تدابیر اختیار کر کے قحط کے مضر اثرات کا سختی سے مقابلہ کیا۔ آپ نے کمیٹی انسداد قحط کے روبرو جو شہادت دی اور سوالات کے جو جوابات دیئے اس سے آپ کی قابلیت ظاہر ہوتی ہے آپ نے قحط اور انتظامات قحط کے متعلق ایک مبسوط رپورٹ بھی تیار کی تھی جس پر اخبارات میں ایک عرصہ تک بحث ہوتی رہی۔

سر سالار جنگ کے انتقال کے بعد جب ان کے فرزند میر لائق علی خاں وزارت عظمیٰ کی خدمت پر فائز ہوئے تو عماد الملک (سید حسین بلگرامی) ان کے مشیر خاص ہوئے اور تمام معاملات میں دخیل ہوئے۔ بقول سرور الملک "مہدی علی سید صاحب کے سامنے مثل گل مہدی پژمردہ بے بود بے رنگ ہو گئے تو ہر روز کتب اخلاق بغل میں دبائے ہوئے ڈیوڑھی وزارت پر حاضر ہوتے مگر درس اخلاق تو ایک طرف باریابی بھی دشواری ہوا کرتی تھی" بعد میں جب سید حسین بلگرامی کو وزیر اعظم نے پرائیویٹ سکریٹری مقرر کیا تو ان کی جگہ ایک انگریزی منشی و ادیب کی ضرورت داعی ہوئی مہدی علی خاں کو موقع مل گیا۔

"اس ذی علم ضرورت سے زیادہ دانا آدمی نے اپنے پاس ہر فن کے اعلیٰ لیاقت کے مددگار جمع کر رکھے تھے" پس ۱۸۸۴ء میں آپ فینانشیل اور پولیٹیکل سکریٹری کے عہدہ پر فائز ہوئے اور آپ کی جگہ مولوی چراغ علی[1] کا تقرر معتمدی مالگذاری پر ہوا ۱۸۸۸ء میں جب نواب سر آسمان جاہ (بشیر الدولہ) وزیر اعظم ہوئے تو مشتاق حسین (وقار الملک) کو اقتدار حاصل ہوا۔ مولوی مہدی علی کی بابت کچھ رعایت ہم وطنی اور کچھ یہ خیال کہ فرد جمع کو ان سے جدا کر کے ان پر تنقیح کر دیا گیا لہٰذا ان وزراء نے ان کو نیم خانہ نشین کر کے چھوڑ دیا۔ مگر "نواب مہدی علی خاں ایسے آدمی نہ تھے کہ بی بلی بن کر چوہوں سے کان کترواتے۔ اب اخباروں میں لمبے چوڑے آرٹیکل نکلنے شروع ہوئے کچھ ہی عرصہ بعد اب مولوی مہدی بھی جو نیم خانہ نشین بنے بیٹھے ہوئے تھے مشیر خاص وزیر اعظم بن گئے۔ اسی زمانہ میں آپ کو محسن الدولہ اور محسن الملک کا خطاب سرفراز ہوا۔ محسن الملک کا خطاب بہت

---

[1] سر آسمان جاہ کی وزارت کے عہد میں مولوی مشتاق حسین (نواب وقار الملک) معتمد مال مقرر ہوئے

موزوں نکلا۔ آپ حقیقت میں قوم کے محسن تھے۔ نواب عزیز جنگ ولا نے وقار الملک کے انتقال پر جو مرثیہ لکھا ہے اس کی ابتدائیوں کی ہے۔

مٹایا اے فلک چن چن کے تو نے اہل دانش کو
ہمیشہ خانہ بربادی ہے داخل تیری عادت میں
نہ سر سید رہے باقی نہ محسن قوم کا مہدی
نذیر احمد پڑے سوتے ہیں تنہا اپنی تربت میں

ریاست حیدر آباد میں انگلستان کی ایک چالاک جماعت نے ایک کمپنی تشکیل دے کر ریاست کے ایک اعلیٰ عہدہ دار کی وساطت سے معدنیات کا ٹھیکہ ایسی شرائط پر حاصل کر لیا جو ریاست کے مفاد کے خلاف تھیں آپ نے ان چالاکیوں کا انکشاف کیا۔ اس سلسلہ میں آپ کو انگلستان بھی بھیجا گیا وہاں بھی آپ نے اپنی علمی اور ثقافتی سرگرمیوں کو جاری رکھا۔ وزیر اعظم گلیڈسٹن سے بھی آپ کی ملاقات ہوئی تقریباً چھ ماہ کے بعد واپسی ہوئی۔

یوں تو حیدر آباد آنے سے قبل ہی آپ کے جوہر کھل چکے تھے اور آپ کی قابلیت کا پورا پورا اندازہ حکام وقت کو ہو چکا تھا لیکن حیدر آباد آنے کے بعد حقیقی معنوں میں آپ کی سیاست دانی تدبر اور انتظامی صلاحیتوں کو ابھرنے کا موقع ملا۔

حیدر آباد میں آپ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ آپ کی کوششوں سے ... ۱۸۸۴ء میں بجائے فارسی کے اردو کو سرکاری زبان قرار دیا گیا۔ برطانوی ہند میں ۱۸۳۵ء میں اردو کو سرکاری زبان قرار دیدیا گیا تھا لیکن ریاست حیدر آباد میں فارسی ہی سرکاری زبان تھی۔

مولوی عبدالحق صاحب نے اپنی کتاب "چند ہم عصر" میں سازشوں کو دیسی ریاستوں اور شخصی حکومت سے مخصوص ظاہر کیا ہے جو صرف جزواً درست ہو سکتا ہے۔ سیاست ہمیشہ سیاست رہی اس کی اشکال بدلتی رہیں لیکن اس کی بنیادی ہیئت میں کوئی فرق نہ آیا۔ اونچی سطح پر کام کرنے والوں کو ہر زمانہ اور ہر دور میں سازشوں ترغیبوں اور پیچیدگیوں کے جال سے سابقہ رہا ہے۔ بڑے بڑے ہوشمند بھی اس جال سے اپنا دامن نہیں بچا سکتے۔ اگر دنیا میں کچھ کر گزرنا ہے تو اس جال میں پھنسے بغیر مفر نہیں۔ کوئی یہ سب کھیل ذاتی اغراض کے لئے کھیلتا ہے اور کوئی ملک وقوم کے مفاد کے لئے۔ کوئی گندگیوں کے دلدل میں پھنس کر رہ جاتا ہے اور کوئی بے داغ نکل آتا ہے۔ سیاست ایسا کھیل ہے جو ہر سربراہ جس کے ہاتھوں میں اقتدار کی باگ ہو کھیلتا ہے۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ وہ یہ کھیل کس طرح کھیلتا ہے اور کن اصولوں پر کھیلتا ہے۔

"اس شخص (محسن الملک) کو اللہ تعالیٰ نے ایسا دماغ عطا فرمایا تھا کہ اگر یہ یورپ میں ہی پیدا ہوتا تو بسمارک اور ٹویز رائلی بھی اس کے آگے کان پکڑتے"!

اگر نواب محسن الملک نے ایک سربراہ کی حیثیت سے ریاست کی سیاست میں حصہ لیا تو یہ محض اس وجہ سے نہ تھا کہ ریاستوں ہی میں ایسے سیاسی جوڑ توڑ ہوتے تھے۔ وہ کہیں اور ہوتے اور کسی اور دور میں بھی ہوتے تو بحیثیت سربراہ ان کو سیاست میں حصہ لینا ناگزیر ہوتا۔ ۱۹ سالہ قیام حیدرآباد میں شاید ہی کوئی دن ہو گا جب کہ ان کو سیاسی جوڑ توڑ نہ کرنے پڑے ہوں۔ انھوں نے یہ سیاسی کھیل کھیلا اور خوب کھیلا۔ اس سلسلہ میں ان کے تعلقات مولوی نذیر احمد سے کشیدہ بھی ہو گئے۔ حالانکہ مولوی نذیر احمد کے حیدرآباد نے میں نواب محسن الملک کی تجویز کو بھی دخل تھا اور مولوی صاحب جب حیدرآباد آئے۔ تو

! کارنامہ سروری از نواب سرور الملک

اور اان ہی کے ہاں قیام کیا تھا ۔

مرزا فرحت اللہ بیگ فرماتے ہیں :۔ کچھ عرصہ تک نواب محسن الملک اور ان (مولوی نذیر احمد) کی بنی رہی بعد میں ایسی کھنچی کہ ٹوٹ گئی ۔ مولوی صاحب کو یہ شکایت تھی کہ محسن الملک مجھ پر دباؤ ڈال کر کام نکالنا چاہتے ہیں محسن الملک کو یہ شکایت تھی کہ مولوی صاحب میرے مقابل ہو کر میرے اکھاڑنے کی فکر میں ہیں ۔ غرض جب عماد السلطنت (میر لائق علی خاں) کا زمانہ آیا اور محسن الملک کی کمان چڑھی تو مولوی صاحب کو میدان سے ہٹ جانا ہی مناسب معلوم ہوا ۔ یہ کشیدگی محسن الملک کے حیدرآباد چھوڑنے کے بعد بھی باقی رہی اور پردہ میں وقتاً فوقتاً نوک جھونک ہوا کرتی تھی ۔

نواب محسن الملک نے حیدرآباد قیام کے دوران میں اپنے علمی ذوق کی تکمیل کا سامان بہم پہنچایا ۔ ان کو مطالعہ کا بے حد شوق تھا ۔ انگریزی زبان سے نابلد تھے لیکن انگریزی کتابیں پڑھوا کر سنتے اور خاص کتابوں کا ترجمہ کروا کر مطالعہ کرتے ۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے مضامین میں انگریزی خیالات کی ترجمانی صاف نظر آتی ہے ۔ انھوں نے فکر کی پوری آزادی کے ساتھ مضامین لکھے ۔ ان کے مضامین ان کی وسیع علمیت، روشنیٔ طبع ۔ استدلال پسندی اور سلجھے ہوئے ذہن کا آئینہ ہیں ۔ عبارت بڑی شگفتہ تھی ۔ ان کی تحریر میں ادبیت کی شان پائی جاتی ہے ۔ روانی فصاحت تسلسل بیان اور اثر پذیری ان کی نثر کی نمایاں خصوصیات ہیں ۔

نواب صاحب معرکہ کے خطیب تھے ۔ ان کی تقاریر زود بیانی اور عزم و ہمت کے مرقعے ہوا کرتی تھیں ۔ ان کی خوش بیانی بے مثال تھی ۔ جو مخالف رجحان رکھنے والوں کو بھی متاثر کرتی تھی ۔ بڑے سے بڑے مجمع کو قابو میں رکھنے کی صلاحیت آپ میں موجود تھی تقریروں میں عموماً ظرافت کی چاشنی ہوا کرتی تھی ۔

محسن الملک نہ صرف اکثر و بیشتر مسائل میں سرسید کے ہم خیال تھے بلکہ سرسید کے دستِ راست تھے۔ حیدرآباد میں قیام کے دوران انھوں نے تحریک سرسید کی ہر طرح مدد کی۔ ریاست میں اپنے وسائل کو انھوں نے سرسید کی تحریک کو آگے بڑھانے میں استعمال کیا۔ تحریک سرسید کے آرگن تہذیب الاخلاق کو محسن الملک کے قلم نے بڑی تقویت پہنچائی اور ان مضامین کی تیاری میں حیدرآباد کی خوش حال اور فارغ البالی کی زندگی کو دخل رہا۔

محسن الملک کو نظم و نسق چلانے کا بڑا اچھا ملکہ تھا اور ماتحتین سے کام لینے کا بڑا اچھا سلیقہ تھا۔ ماتحت ملازمین سے ان کا رویہ بہت اچھا تھا اور یہی وجہ تھی کہ ماتحت نواب صاحب کی ہدایتوں کی تعمیل پوری دلجمعی سے کرتے تھے آپ بڑے مردم شناس تھے۔

۱۸۹۳ء میں جب سر وقار الامراء مدار المہام (صدر اعظم) مقرر ہوئے تو امراء اور عہدہ داروں کی باہمی رقابتیں پوری قوت کے ساتھ ابھریں۔ "نواب وقار الامراء فطرتاً قوتِ فکر و غور میں اس قدر کوتاہ تھے کہ یہ چاہتے تھے کہ کوئی دوسرا میرے واسطے فکر و غور کر لیا کرے خود اپنے دماغ پر زور ڈالنے سے عاری تھے۔ بس ہر کہ و مہ کی رائے کو قبول کر لیا کرتے تھے۔ ایک شخص کی رائے کو قبول کیا ہے کہ دوسرا آن پہنچا اور اس نے ان کو اپنی رائے پر گھسیٹ لیا۔ پس بہت جلد اہلِ فطرت عہدہ داروں کے پھندے میں پھنس گئے۔"[1] محسن الملک بھی ان اثرات سے محفوظ نہ رہ سکے اور اس صورتِ حال کو برداشت نہ کر سکے۔ اسی سال آپ کی عمر کے ۵۵ سال بھی پورے ہو رہے تھے۔ چنانچہ آپ کو

---

[1] کارنامہ سروری از نواب سرور الملک

وظیفہ حسنِ خدمت آٹھ سو روپیہ ماہوار تاحیات منظور ہوا ۔ اور آپ نہایت عزت واحترام کے ساتھ حیدر آباد سے رخصت ہوئے ۔ آپ کے رخصت کے وقت حیدر آباد میں کہرام مچ گیا تھا اور ہزارہا آدمی کا ٹھٹھ اسٹیشن کے باہر اور اندر لگا ہوا تھا ۔ اس سے ان کی ہر دلعزیزی کا اندازہ ہوتا ہے ۔

حیدر آباد میں آپ کی یادگار ایک کوٹھی رہ گئی جو محسن الملک کی کوٹھی سے مشہور تھی ۔ ایک مدت تک اس میں ویکاجی ہوٹل رہا اور اب تھری ایس ہوٹل ہے ۔ یہ ایک عالیشان عمارت تھی اور آپ کے زمانہ میں مغربی طرز کے فرنیچر سے نہایت سلیقہ سے سجائی گئی تھی ۔ آپ کا طرزِ معاشرت اور بود و باش کا طریقہ بالکل انگریزوں کی تقلید میں تھا ۔ البتہ غذائیں ہندوستانی استعمال کرتے تھے جو مرغن نفیس اور بہت عمدہ ہوتیں ۔

مردِ حق گو

نواب عمادالملک مولوی سید حسین بلگرامی کا شمار حیدرآباد کی ایسی شخصیتوں میں کیا جاسکتا ہے جن کی بلند پایہ علمی خدمات اور تعلیمی کارناموں پر دکن ہی نہیں سارا ہندوستان ناز کرسکتا ہے ان کے ہم عصران کی بڑائی کا پورا پورا اندازہ نہ کرسکے اور شاید اسی لئے اہل دکن کی جانب سے ان کی خدمات کا خاطر خواہ اور قابل لحاظ اعتراف نہ ہوسکا۔ علم اور تعلیمی میدان کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جس میں اس شخص نے اپنا کردار ادا نہ کیا ہو اور اپنا لوہا نہ منوایا ہو۔ حیدرآباد میں تعلیم جدید کی ساخت و پرداخت بہت کچھ نواب صاحب موصوف ہی کے ہاتھوں عمل میں آئی وہ اپنے اعلیٰ کردار، علمی سرپرستی اور بے شمار خوبیوں کی وجہ سے ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ عزت کے ساتھ یاد رکھے جانے کے مستحق ہیں۔

نواب عمادالملک کا خاندان اودھ میں معزز رہا ہے آپ کے والد ۱۸۷۹ء میں حیدرآباد آئے۔ آپ کے جداعلیٰ سید محمد صغریٰ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مرید تھے۔ یہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے دہلی سے نکل کر اودھ میں بلگرام کو فتح کیا اور وہیں سکونت اختیار کرلی۔ آپ کے دادا سید کریم حسین خاں شاہ اودھ

نصیر الدین حیدر کی جانب سے گورنر جنرل ہند کے دربار میں وکالت وسفارت کے فرائض انجام دیتے تھے۔ آپ کے والد سید زین الدین حسین بنگال اور بہار کے مختلف علاقوں میں انگریزی سرکار کے تحت ڈپٹی کلکٹر اور ڈپٹی مجسٹریٹ کی حیثیت سے کارگذار رہے اور وظیفہ کے بعد نواب مختار الملک کی وزارت کے زمانہ میں حیدرآباد آئے اور مجلس دریافت انعام کے رکن دوم کی حیثیت سے ان کا تقرر عمل میں آیا اور ۱۸۸۳ء میں آپ نے حیدرآباد میں وفات پائی۔

نواب عماد الملک ضلع گیا کے قصبہ صاحب گنج میں ۱۶ اکتوبر ۱۸۴۲ء کو پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ پھر کلکتہ اور ڈھاکہ میں ۷ سال سے ۱۴ سال کی عمر تک عربی زبان میں نصاب نظامیہ کی تحصیل کی۔ ۱۸۵۶ء میں انگریزی تعلیم شروع کی ۱۸۵۹ء میں فرانسیسی درسگاہ لامارٹی نیئر میں شریک ہوئے اور ۱۸۶۱ء میں میٹرک کا امتحان بدرجہ اعلیٰ کامیاب کیا اور پریذیڈنسی کالج سے ۱۸۶۶ء میں گریجویشن کی تکمیل درجہ اول میں آنرز کے ساتھ کی۔ اس کے بعد ملازمت کے لئے تعلیمی شعبہ کا انتخاب کیا اور ڈپٹی کلکٹری پر جو اپنے والد کے اثر سے مل سکتی تھی اس شریف پیشہ کو ترجیح دی۔ چنانچہ لکھنؤ کے کیننگ کالج میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے اور کچھ عرصہ "لکھنؤ ٹائمز" کے ایڈیٹر بھی رہے جو تعلقداران اودھ کے مفادات کی حفاظت کے لئے جاری کیا گیا تھا۔

سر سالار جنگ گورنر جنرل ہند (لارڈ نارتھ بروک) سے ملاقات کے لئے ۱۸۷۲ء میں کلکتہ گئے اور لکھنؤ ہوتے ہوئے واپس ہوئے لکھنؤ میں اودھ کے چیف کمشنر جنرل بیرو نے عماد الملک کو سر سالار جنگ سے ملایا۔ نواب سر سالار جنگ موصوف

کی قابلیت سے بے حد متاثر ہوئے اور انھیں حیدرآباد میں ملازمت کی پیشکش کی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ نواب سالارجنگ کے انتخاب کی داد دینی پڑتی ہے چنانچہ سر سالارجنگ کے اصرار پر موصوف تین ماہ کی رخصت لے کر ۱۸۷۳ء میں حیدرآباد آئے اور معتمد خاص کی حیثیت سے ان کا تقرر عمل میں آیا۔ مابین سرکارین انگریزی مراسلت آپ کے سپرد تھی۔ ۱۸۷۶ء میں سر سالارجنگ نے یورپ کا سفر کیا تو آپ بھی ساتھ تھے۔ ۱۸۸۳ء میں سر سالارجنگ کا انتقال ہوا اور ان کے فرزند میر لائق علی مدار المہامی سے سرفراز ہوتے اور ایک کونسل آف اسٹیٹ قائم ہوئی تو نواب عماد الملک ان کے معتمد کی حیثیت سے نو سال تک کارگذار ہے۔ اس دوران کچھ عرصہ تک معتمد پیشی اعلیٰ حضرت بندگان عالی بھی رہے۔ نواب عماد الملک معتمد امور متفرقات مقرر ہوئے اور سر رشتہ تعلیمات جو معتمدی مالگذاری کے تحت تھا آپ سے متعلق کر دیا گیا جب معتمدی امور متفرقات برخاست کی گئی تو آپ کو ناظم تعلیمات مقرر کیا گیا اور وظیفہ پر علیحدگی تک آپ اس خدمت پر رہے اس طرح کم و بیش ۳۲ سال تک معتمدی تعلیمات اور ناظم تعلیمات کی حیثیت سے کارگذار رہے اور ریاست حیدرآباد کے محکمہ تعلیمات کی باگ ڈور آپ کے ہاتھ میں رہی۔ اس کے بعد دو سال تک انڈیا کونسل کے ممبر رہے لیکن انگلستان کی سردی موافق نہ ہونے سے مستعفی ہو گئے۔ سالارجنگ ثالث نواب یوسف علی خاں وزیر اعظم مقرر ہوتے تو آپ مشیر خاص مدار المہام کی حیثیت سے دو سال تک کارگذار رہے۔

جب وائسرائے کی کونسل میں توسیع ہوئی اور شعبہ تعلیمات کی جدید رکنیت قائم

کی گئی تو وائسرائے نے نواب عماد الملک کو نامزد کرنا چاہا لیکن بوجہ ضعیفی آپ نے اس کو قبول نہ کیا۔

آصف جاہ خامس نواب میر محبوب علی خاں کی تخت نشینی کے موقع پر ۱۸۸۳ء میں آپ کو مومن جنگ کا خطاب سرفراز ہوا۔ ۱۸۸۷ء میں عماد الدولہ اور ۱۸۹۰ء میں ..... عماد الملک کے خطابات سرفراز ہوئے۔ ۱۹۰۸ء میں حکومت ہند نے سی ایس آئی کا اعزاز مرحمت کیا۔ ۱۹۱۸ء میں جامعہ عثمانیہ کا قیام عمل میں آیا تو ۱۹۲۰ء میں جامعہ عثمانیہ نے آپ کی خدمت میں ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری پیش کر کے آپ کی خدمات کا اعتراف کیا۔ اسی طرح مسلم یونیورسٹی نے بھی ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری دی۔ اس وقت نواب صاحب کی عمر ۸۳ سال کی تھی۔ آپ دوبارہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے صدر منتخب ہوئے جس وقت نواب عماد الملک نے محکمہ تعلیمات کی باگ اپنے ہاتھ میں لی تو حیدرآباد میں ۴ بڑے مدرسے تھے۔ مدرسہ عالیہ جو سالار جنگ کی ڈیوڑھی میں تھا۔ دوسرا دارالعلوم جہاں مشرقی علوم وفنون کی تعلیم ہوتی تھی۔ تیسرا سٹی انگلش اسکول اور چوتھا چادر گھاٹ ورناکلر اسکول۔ عماد الملک نے معتمد تعلیمات ہونے کے بعد ۱۸۷۸ء میں آخرالذکر دونوں مدارس کو ضم کر کے اس کا نام حیدرآباد کالج رکھا اور مدراس یونیورسٹی سے الحاق فرمادیا چنانچہ اس میں ایف اے اور بی اے کی تعلیم ہونے لگی۔ ڈاکٹر لٹنر (؟) کانت چٹوپادھیائے اس کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ یہ وہی لشمی کانت چٹوپادھیائے ہیں جنھوں نے بعد میں اسلام قبول فرمایا تھا اور جن کے دو لکچرس "میں نے اسلام کیوں قبول کیا" اور "محمد پیغمبر اسلام" کو میں نے حال میں شائع کیا ہے اس کے ۱۷ ، ۱۸ سال بعد ۱۸۹۶ء میں حیدرآباد کالج اور مدرسہ عالیہ دونوں ملا دیئے گئے اور

اسکا نام نظام کالج قرار پایا اور سروجنی نائیڈو کے والد ڈاکٹر اگھور ناتھ چٹوپادھیائے اس کے پہلے پرنسپل مقرر ہوئے۔ دارالعلوم میں بدستور مشرقی علوم کی تعلیم ہوتی تھی۔ نواب عماد الملک نے اس کا الحاق پنجاب یونیورسٹی سے کر دیا۔

نواب صاحب موصوف نے سررشتہ تعلیمات کی ضرورتوں کا لحاظ کرتے ہوئے مختلف علوم پر موزوں ذی علم اصحاب سے کارآمد کتابیں لکھوائیں اس کے علاوہ بہت ہی بلند پایہ کتابیں نواب صاحب کی ایما سے لکھی گئیں۔ ان میں نواب عزیز جنگ کی کتاب "سیاق ونن" کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے جو نواب عماد الملک کی فرمائش پر لکھی گئی۔ اور نواب صاحب کے نام سے معنون کی گئی نواب صاحب کا سب سے بڑا علمی کارنامہ دائرۃ المعارف کا قیام ہے۔ علوم اسلامیہ کی نادر و نایاب مخطوطات کی طباعت واشاعت کے لئے آپ نے اور ملا عبد القیوم نے مل کر ۱۸۸۸ء میں اس ادارہ کی بنیاد ڈالی۔ اس ادارہ کا مقصد مختلف علوم وفنون پر نادر اور نایاب قلمی کتابوں کو بعد تصحیح ومقابلہ شائع کرنا تھا۔ چنانچہ اس ادارہ نے دو سو سے زائد مخطوطات شائع کیں۔ دائرۃ المعارف اس وقت تک قائم ہے مولوی عبد الحق نے ۱۹۵۹ء میں ایک تصنیف "چند ہم عصر" میں یہ فرمایا ہے کہ عماد الملک کی ایک بے نظیر علمی یادگار ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی جو درست نہیں ہے۔

نواب صاحب نے کتب خانہ آصفیہ کی بنیاد ڈالی اور سید علی حیدر طباطبائی اس کے پہلے مہتمم مقرر کئے گئے۔

۱۹۱۰ء میں عماد الملک نے انگریزی زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ کرنا شروع کیا اور ۱۲،۱۰ سال کی مدت میں سولہ پاروں کا انگریزی ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ مکمل نہ ہوسکا۔

۱۹۱۲ء میں انجمن ترقی اردو کا کام بابائے اردو مولوی عبدالحق کے تفویض ہوا تو انھوں نے صدارت کے لئے نواب عماد الملک کا نام پیش کیا جس کو انجمن کی مجلس انتظامی نے بالاتفاق منظور کیا۔

آپ نے "قلمرو نظام کا تاریخی اور توضیحی تذکرہ" کے نام سے ایک کتاب انگریزی زبان میں لکھی۔ ان کے انگریزی مضامین، نظموں، مقالات اور خطبات کا مجموعہ شائع ہوا تو اس کا پیش لفظ جامعہ عثمانیہ کے شعبہ انگریزی کے نوجوان لکچرر سید عبداللطیف صاحب سے لکھوایا اور اس طرح اپنی جوہر شناسی کا ثبوت دیا کیونکہ یہی نوجوان لکچرار آج دنیائے اسلام کا ایک بڑا عالم شمار ہوتا ہے۔

سر سالار جنگ کی سوانح حیات بھی آپ نے بزبان انگریزی لکھی جس کا ترجمہ مسٹر مہدی حسن جوہر نے اردو میں "مرقع عبرت" کے نام سے شائع کیا۔

حیدرآباد آنے کے دوسرے ہی دن آپ نے ایک رسالہ مخزن الفوائد کے نام سے نکالا جو دو سال تک جاری رہا جس میں علمی مضامین شائع ہوتے رہے ۱۹۰۷ء میں آپ نے نواب عزیز جنگ ولا کی تصانیف سے متعلق انگریزی میں اپنی رائے کا اظہار فرمایا۔

نواب عماد الملک راست گو اور صاف گو تھے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق اپنی کتاب "چند ہم عصر" میں لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ نظام دکن میر محبوب علی خاں نے اعلیٰ ارکان ریاست سے پوچھا کہ عوام کا ان کی نسبت کیا خیال ہے ہر ایک نے تعریف کے پل باندھ دیئے۔ نواب عماد الملک خاموش رہے مگر دریافت کرنے پر فرمایا لوگ کہتے ہیں کہ آپ شراب پیئے پڑے رہتے ہیں کام کی طرف

بالکل توجہ نہیں کرتے ۔ نظام دکن نے اس راست گوئی کے سلسلہ میں انہیں اس کی ایک بیش قیمت انگوٹھی عطا فرمائی ۔ اس طرح نواب میر عثمان علی خاں نے مسئلہ ازدواج پر بحث کے دوران فرمایا کہ اسلام میں اس بارے میں سہولت ہے نواب عماد الملک نے فوری ٹوکا کہ اسلام نے اس معاملہ میں ایسی کڑی شرط لگا رکھی ہے کہ کوئی ایک سے زائد بیوی نہیں رکھ سکتا ۔ شاہ دکن نے خفا ہوکر انھیں ٹرٹر پر سے اٹھا دیا ۔ دوسرے ہی روز نواب عماد الملک اپنے مقررہ پروگرام کے بموجب اوٹی کے لئے روانہ ہوئے ۔ شاہ دکن کو خبر ہوئی تو انھوں نے ذریعہ تار واپس آنے کی خواہش کی ۔ عماد الملک کو یہ تار قاضی پیٹ اسٹیشن پر ملا ۔ انھوں نے اس کا جواب دیا کہ وہ پروگرام کے مطابق جا رہے ہیں اور ایک ماہ بعد واپس ہوں گے ۔ اوٹی کی روانگی کو حیدرآباد میں عام طور پر شہر بدری ہی تصور کیا گیا ۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے اپنی کتاب چند ہم عصر میں بھی یہی لکھا ہے کہ شاہ دکن نے خفا ہوکر ان کو شہر بدر کیا جو درست نہیں ہے ۔

نواب عماد الملک بہت نفیس کھانا کھاتے تھے اور اس سلسلہ میں اچھا ذوق رکھتے تھے ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا انگریزی، فرانسیسی، عربی، اور فارسی پر عبور تھا لیکن بے موقع اور بلا ضرورت انگریزی بات چیت کو ناپسند کرتے تھے ۔

مہم پسند عالم

اس سوال کا اہلِ دکن کے پاس کوئی جواب نہیں کہ ایسی شخصیت کے ساتھ انھوں نے کیوں بے اعتنائی برتی۔ جس کے علمی اور ادبی کارناموں کے سرسری جائزہ کے لئے بھی بقول "پروفیسر عالم خوندمیری" ایک قاموسی قابلیت کی ضرورت ہے اور جس کی ذات حیدرآباد کے لئے بقول محمد عمر مہاجر بیسویں صدی کے ربع اول میں ہر قسم کی معلومات بہم پہنچانے کا واحد ذریعہ تھی۔

بے اعتنائی کا سوال تو بعد میں آتا ہے۔ جہاں تک میں نے غور کیا حضرت ولاؔ کی ہمہ گیر اور یکتا شخصیت کا پوری طرح ادراک ہی نہیں کیا جا سکا اور اس کو سمجھا یا پہچانا Comprehend نہیں کیا جا سکا۔ حضرت ولاؔ اپنی جگہ ایک ادارہ تھے۔ اور انھوں نے اپنی مہم پسندی کے باعث جو گوناگوں علمی کام انجام دیئے ہیں ان کے لئے ایک زندگی کافی نہ تھی انھوں نے تعجب انگیز طریقہ پر علم کے کئی شعبوں میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا ثبوت دیا اور ہر شعبہ میں اپنا لوہا منوایا۔

احمد عبدالعزیز کہ یہی حضرت ولاؔ کا نام تھا۔ ۲۸ ؍ دسمبر ۱۸۶۰ء کو بمقام نیلور

پیدا ہوئے ۔ آپ کا تعلق جنوبی ہند کے اس معزز اور ممتاز خاندان سے تھا جو ۷۰۰ھ میں بصرہ سے کوکن آیا اور نوائط کے نام سے مشہور ہوا پرتگالیوں کے بحری برتری حاصل کرنے سے قبل سمندر پر مسلمانوں کا تسلط زیادہ تر اسی خاندان کی وساطت سے تھا اور بقول مولانا سلیمان ندوی انگریزی لفظ نیوی اسی خاندان کے نام سے ماخوذ ہے ۔ یہ خاندان تجارتی اور علمی میدان میں بھی نمایاں تھا مولوی ادریس پہلے شخص تھے جو نیلور میں سکونت پذیر ہوئے ۔ آپ کے صاحبزادہ محمد عبادت رونگول کے قلعہ دار مقرر ہوئے ۔ حضرت ولا کے والد ماجد محمد نظام الدین صاحب پہلے شخص تھے جو بزمانہ نواب افضل الدولہ بہادر، سر سالار جنگ اول کی تحریک پر ۱۸۶۵ء کے لگ بھگ حیدرآباد میں بطور ملازم داخل ہوئے ۔

حضرت ولا صرف ۱۴ سال کی عمر میں سلک ملازمت میں داخل ہوئے اور تیس روپے ماہوار کی جائیداد اہلکاری پر آپ کا تقرر ہوا ، لیکن آپ نے ملازمت کے ساتھ ساتھ تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رکھا ۔ اپنی سخت محنت اور دیانت کی وجہ سے آپ نہ صرف اپنے ساتھیوں میں ممتاز رہے بلکہ بالاتر عہدہ داروں نے ہمیشہ آپ کی قدر افزائی فرمائی اور زینہ بہ زینہ ترقی کرتے ہوئے آپ خدمت اول "تعلقداری" سے وظیفہ "حسن خدمت" پر علیحدہ ہوئے ملازمت کے سلسلہ میں آپ نواب وقار الملک ، مولوی مشتاق حسین : نواب محسن الملک ، نواب اعظم یار جنگ ، نواب عماد الملک وغیرہ کے ساتھ رہے اور سب نے آپ کی قابلیت کو تسلیم کیا ۔

" وظیفہ حسنِ خدمت "، پر علیحدہ ہونے کے بعد حضور نظام نے آپ کا تقرر صرفخاص مبارک میں خدمت صدر محاسبی پر کیا، اور بہت جلد معزز کمیٹی صرفخاص کا رکن بھی مقرر کیا گیا۔ لیکن آپ کی سخت اصول پسندی کے باعث آپ زیادہ دن تک اس خدمت پر نہ رہ سکے اور مستعفی ہو گئے ۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے آپ لکھتے ہیں ۔

" محکمہ صدر سے جو منظوریاں خارج از اقتدار آئیں میں نے ان پر اعتراض کیا۔ معزز کمیٹی صرفخاص مبارک نے مقدمات قابل منظوری بارگاہ اقدس میں بہ اختیار خود جو حکم آخر دے دیا تھا میں نے اس کی اطلاع معزز کمیٹی کو کردی جو انعامی معاشیں خارج از اقتدار جاری کردی گئی تھیں اور جو انعام واقعات غیر صحیحہ پر حاصل کئے گئے تھے ان سب کو تحریراً معزز کمیٹی کے اجلاس میں پیش کر دیا میرا اپنے فریضہ کو بغیر کسی خوف کے اخلاقی جرات کے ساتھ ادا کرنا حاکم اعلیٰ کو سخت ناگوار خاطر تھا۔ کسی صدر محاسب سابق نے ایسی آزادی کے ساتھ اپنے فرائض ادا نہیں کئے۔ اسی کا سبب تھا کہ ۔

اے روشنی طبع تو بر من بلا شدی

کے مصداق بنا۔ جھوٹی خوشامد میری عادت نہ تھی ۔ حاشیہ برداری میرا کام نہ تھا۔ جب اعلیٰ حاکم کے اختلاف اور طرز عمل کے صدموں کا تحمل میرے لئے ناقابل برداشت ہو گیا تو میں مستعفی ہوا ۔"

علمی خدمات کا ذوق حضرت ولاؔ کی فطرت میں ودیعت کیا گیا تھا۔ آپ نے گوناگوں سرکاری مصروفیات کے باوجود اپنے ذوق کی تسکین کے سامان فراہم کئے اور اپنی زندگی کو منظم کیا اور اوقات کی اس انداز سے پابندی کی کہ فنون مختلفہ پر قابل قدر تحقیقی کتابیں بطور یادگار چھوڑی ہیں۔ یہ مختصر مضمون ان بے شمار اور عظیم الشان علمی کارناموں کا متحمل نہیں ہو سکتا اور نہ ان کا احاطہ کر سکتا ہے اس لئے نہایت اختصار کے ساتھ چند کا ذکر کیا جاتا ہے۔

"آصف اللغات" مبسوط فارسی اور اردو لغت ہے۔ یہ حضرت ولاؔ کا ایسا کارنامہ ہے کہ اگر ان کے اور کاموں کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تو یہی لغت ان کے نام کو زندہ رکھنے کے لئے کافی ہے۔ اس لغت میں فارسی زبان کے تمام مروجہ الفاظ مفرد اور مرکب اصطلاحی اور غیر اصطلاحی نیز ضرب الامثال، کہاوتیں، مقولے، محاورات سب معہ اسناد اور مستند اساتذہ کے کلام کے حوالوں سے پیش کئے گئے ہیں اور ہر ایک کا اردو ترجمہ بھی پیش کیا گیا ہے اس گراں قدر لغت کی ترتیب و تدوین میں فارسی اور اردو کی کم و بیش چالیس مسلمہ اور معیاری لغات سے استفادہ کیا گیا ہے۔ یہ لغت ۱۷ جلدوں پر مشتمل ہے جو ۱۹۰۵ء اور ۱۹۲۲ء کے درمیان شائع ہوئیں۔ ہر جلد کی ضخامت چھ سو صفحات ہے۔ اور سترہ جلدوں میں صرف حرف "ج" تک کا احاطہ ہوا ہے اسی سے اس کام کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔

آخری عمر میں حضرت ولاؔ اس کام کو جامعہ عثمانیہ یا فارسی داں اصحاب کی ایک جماعت کے تفویض کرنے کے لئے کوشاں رہے کیوں کہ ان کو اندیشہ

تھا کہ وہ اپنی زندگی میں اس کام کی تکمیل نہ کر سکیں گے۔ لیکن افسوس کہ جس کام کی ایک شخص نے تن تنہا ابتدا کی، اس کو افراد تو درکنار، ادارے بھی تکمیل کو نہ پہنچا سکے۔ البتہ حضرت ولاؔ نے لغت نویسی کے لیے جو خطوط آصف اللغات میں متعین کیے ہیں وہ آئندہ کام کرنے والوں کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوں گے۔

ولائے حافظ، حضرت ولاؔ کی عمر کے آخری دنوں کا کلام ہے جو ناتمام اور غیر مطبوعہ ہے۔ ولاؔ نے حافظ شیرازی کی ہر غزل پر دو، دو اور تین تین غزلیں کہی ہیں اپنی زندگی میں وہ ردیف "م" تک پہنچ سکے۔

مجموعہ قوانین مالگزاری۔ پانچ جلدیں اور انڈکس پر مشتمل ہے اس میں مالگزاری کے جملہ قوانین، گشتیات و احکام اور سررشتہ آبکاری جنگلات، کروڑ گیری، عطیات وغیرہ کے منظورہ احکام معہ تشریحات درج ہیں۔ تمام دفاتر سرکار عالی کے لئے اس مجموعہ کی وہی حیثیت تھی جو آج کل محکمہ مال کے لئے بی ایس اوز کی ہے۔ دفاتر سرکاری اور وکلاء کے لئے یہ مجموعہ ناگزیر رہا ہے اور اس وقت بھی اس کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔

ترکاری کی کاشت (۱۹۰۱ء) کھجور کی کاشت (۱۹۰۴ء) اور انگور کی کاشت (۱۹۰۵ء) فن زراعت پر حضرت ولاؔ کی مبسوط کتابیں ہیں حیوۃ الحمام (۱۹۰۶ء) میں کبوتروں کے اقسام اور ان کی نگہداشت، غذا، بیماری، علاج ان کے طبی قواعد سے متعلق مفید اور دلچسپ معلومات فراہم کی گئی ہیں اردو میں یہ اپنی طرز کی واحد کتاب ہے۔

اعظم العطیات (۱۸۹۵ء) میں عطا، نقدی، معاش، جاگیرات و انعامات اور محکمہ مال سے متعلق دیگر اصلاحات کی تشریح کی گئی ہے۔ راقم الحروف اور ملک کے نامور محقق ضیاء الدین احمد شکیب کی مشترکہ کوشش سے اس کتاب کے ایسے حصوں کو حذف کر کے جو فی الحال غیر ضروری ہیں جدید ایڈیشن مرتب کیا گیا ہے اور یہ کتاب جامع العطیات کے نام سے اکیڈمی نے شائع کی ہے۔

تاریخ النوائط (۱۹۰۴ء) خاندان نائط کی تاریخ ان کے رسوم و رواج معاشرت اور مشاہیر خاندان کا تذکرہ ہے۔ ضروری اضافوں کے ساتھ اس کتاب کا جدید ایڈیشن مرتب کرنا بھی ضیاء الدین احمد شکیب کے پیش نظر ہے۔

حضرت ولاؔ کی تصانیف پر ان کے معاصرین نے تبصرے کئے ہیں جن میں مولانا حالیؔ اور مولانا شبلی قابل ذکر ہیں۔

محمد عبد الجبار خاں ملکاپوری نے تذکرہ محبوب الزمن جلد دوم ۱۳۲۹ھ میں نصیر الدین ہاشمی نے دکن میں اردو (۱۹۳۶ء) میں، محمد عمر مہاجر نے "مرقع سخن" جلد دوم (۱۹۳۷ء) میں اور تمکین کاظمی نے نقوش لاہور شخصیات نمبر حصہ دوم (۱۹۵۶ء) میں حضرت ولاؔ کا ذکر کیا ہے۔

حال میں حضرت ولاؔ کی علمی و ادبی خدمات پر ایم۔ اے کی طالبہ محترمہ وہاب حیدر نے ایک تحقیقی مقالہ لکھا ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ابھی وہ وقت نہیں آیا ہے کہ اس محقق کے علمی کارناموں کی صحیح معنوں میں قدر کی جائے۔

قابل فخر اہلکار

ہمارے معاشرے میں سب سے بدقسمت طبقہ وہ ہے جس کو اہلکار کہا جاتا ہے۔ یوں بھی نچلے متوسط طبقہ کی زندگی کے مسائل احاطہ بیان وگمان سے باہر ہیں ایسے ہی طبقہ کے ایک فرد غلام محمد ہیں۔ جب مجھے کوئی اہلکار عام اہلکاروں سے زیادہ مستعد، کارگزار اور کام میں دلچسپی لینے والا نظر آتا ہے تو بڑا اچنبھا ہوتا ہے اور وہ عام انسانوں سے مختلف اور بڑے آدمی معلوم ہوتا ہے کیوں کہ اہلکاروں کے طبقہ کو جن معاشی مسائل اور مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے ان کے پیش نظر ایک اہلکار کو بحیثیت انسان ہونے کے کارگزار اور مستعدی کی عام سطح سے بلند نہ ہونا چاہئے۔ مجھے غلام محمد عام اہلکاروں سے کہیں زیادہ مستعد اور کارگزار نظر آئے۔ اگر زندگی کی سہولتیں حاصل ہوں اور حالات سازگار ہوں تو کام نہ کرنے پر حیرت ہوتی ہے۔ لیکن غلام محمد کی حد تک حیرت اس پر ہوتی تھی کہ ان کو نامساعد حالات کے باوجود کام کرنے کی امنگ اور ولولہ کہاں سے آیا اگر بڑائی کا معیار یہ نہ ہو کہ کس نے کیا کام کیا بلکہ یہ ہو کہ کس نے کن حالات میں کام کیا۔ اور اچھی طرح اپنے فرائض کو انجام دیا تو غلام محمد بڑائی کے معیار پر پورے اتریں گے۔

وہ مجھے بڑے آدمی معلوم ہوئے اور اسی وجہ سے ان کے حالات قلمبند کئے جارہے ہیں۔

ہمارے معاشرے میں عہدہ داروں میں جماعتی احساس زیادہ ہوتا ہے اور وہ ایک خاص احساس برتری کا شکار رہتے ہیں۔ جب کوئی اہلکار ان کے سامنے آتا ہے تو ان کو وہ صرف اہلکار نظر آتا ہے اور بس۔ اس میں جو خوبیاں ہوتی ہیں وہ ان کو دیکھنے کی زحمت گوارہ نہیں کرتے ہیں نے اس عام کمزوری کو پیش نظر رکھ کر ہمیشہ اپنی آنکھیں کھلی رکھنے کی کوشش کی جس کے نتیجہ میں مجھے غلام محمد ایک مثالی شخصیت کے مالک نظر آئے۔ ہمارے آج کے اہلکار جن کے کاندھوں پر نظم ونسق کا زیادہ بار ہے ان کی زندگی سے کچھ سیکھ سکیں تو میں سمجھوں گا کہ میری کوشش کامیاب رہی۔ مولوی غلام محمد ۲۱ر نومبر ۱۸۸۹ء کو بلدہ حیدرآباد کے محلہ بازارکوکہ میں پیدا ہوئے آپ کے والد کا نام حاجی غلام محی الدین تھا۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ عظمت الاسلام تحت مسجد ملا محی الدین بازار کوکہ میں ہوئی جہاں حضرت حافظ سید شاہ محمد عظمت اللہ قادری سے تلمذ حاصل کیا اس کے بعد جامعہ نظامیہ اور دارالعلوم میں تعلیم پائی جہاں علی الترتیب حکیم محمود صمدانی اور رشیر الدین سے تحصیل علم کیا بعدازاں لا کلاس میں شرکت کی یہاں نواب اصغر یار جنگ لکچرار تھے آپ نے امتحان جوڈیشل کامیاب کیا اور ۲۰ رسال کی عمر میں (مارچ ۱۹۱۰ء) بمشاہرہ ۵۰ روپیہ سکہ عثمانیہ محکمہ امور مذہبی میں آپ کا تقرر ہوا اس وقت حکیم الحکما نواب محی الدولہ ناظم امور مذہبی تھے، .... اس کے بعد مولوی لطیف احمد اختر مینائی (فرزند امیر مینائی) کچھ عرصہ کے لئے نظامت امور مذہبی پر فائز رہے۔

غلام محمد صاحب نے صاحبزادہ اکرام اللہ خاں اور نواب فضیلت جنگ کے دور نظامت میں بھی محکمہ مذہبی میں کام انجام دیا پھر جب نواب اختیار جنگ دوبارہ ناظم امور مذہبی ہوئے تو موصوف نے آپ کو اپنی پیشی میں لیا اور ایک عرصہ تک آپ نواب موصوف کی پیشی میں کام کرتے رہے پیشی کے اہلکار میں کئی خوبیوں کا ہونا ضروری ہے۔ وہ نہ صرف غیر معمولی محنتی کارداں اور مستعد ہو بلکہ عہدہ دار کی طبیعت کو سمجھنے والا بھی ہو اس کا ذہین ہونا اور اچھے حافظے کا مالک ہونا بھی ضروری ہے۔ اسے دفتر کے مختلف شعبوں سے پوری واقفیت ہو دفتر کے ذیلی عہدہ داروں اور اپنے ساتھیوں سے تعلقات ہوں۔ اس میں ذمہ داری کا پورا احساس ہو ظاہر ہے کہ جب تک کوئی اہلکار ان تمام خصوصیات کا حامل نہ ہو اور اپنے ساتھیوں میں ممتاز حیثیت کا مالک نہ ہو وہ عہدہ دار کی نظر انتخاب میں نہیں آسکتا۔ اس لئے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ غلام محمد نہ صرف پیشی میں کام کرچکے ہیں بلکہ ایک عرصہ دراز تک یہ کام انجام دے چکے ہیں تو ظاہر ہے کہ ہم موصوف میں ان تمام خوبیوں کو موجود پاتے ہیں۔ اہلکار پیشی میں مندرجہ بالا خوبیوں کے ساتھ ساتھ عموماً ایک خصوصیت ہوتی ہے اور وہ ہے خوشامد کی عادت اور سازشی فطرت یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ غلام محمد میں یہ دونوں باتیں بالکل نہیں بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ان میں کوئی کمی ہے تو یہی کہ وہ خوشامد یا سازش نہیں جانتے بالکل نہیں جانتے۔ اس کے بعد نواب دین یار جنگ اور مولوی عبدالقیوم کے دور نظامت میں گو غلام محمد پیشی میں نہیں رہے لیکن نہ صرف اہم اور ذمہ دارانہ کام ان سے متعلق رہے بلکہ ان کے سیعنہ کے علاوہ دیگر کام بھی انھیں سونپے گئے اس طرح ۳۵ سال ملازمت

کرنے کے بعد مولوی غلام محمد نومبر ۱۹۴۴ء میں بعہد مولوی عبدالقیوم خاں وظیفہ
حسن خدمت پر علیحدہ ہوئے۔ لیکن چوں کہ آپ کی خدمات بے بدل تھیں اور
محکمہ سے متعلق آپ کی ہمہ گیر واقفیت سے استفادہ ضروری تھا اس لئے بعد حصول
وظیفہ آپ کو اوقافی جائیداد پر مامور کیا گیا۔ اگرچہ آپ کی خدمت نگرانکار
مسالخ تھی لیکن صبح میں اپنے مفوضہ فرائض انجام دینے کے بعد آپ دن بھر دفتری
کام میں کافی وقت صرف کرتے چنانچہ میرے زمانہ نظامت میں شائد ہی کوئی دن
جاتا جب کہ غلام محمد کو کسی دیرینہ مثل کی تلاش کی ہدایت نہ کی جاتی ہو یا کسی پیچیدہ
کارروائی میں نوٹ دینے کے لئے نہ کہا جاتا ہو۔ ایک دفعہ ایک مددگار نے ان سے
بگڑ کر کہا کہ تم پرانی کارروائیوں کے حوالے کیوں دیتے ہو اور قدیم امثلہ پیش کرتے
ہو جس سے کام بڑھتا ہے مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوتا تھا کہ غلام محمد وظیفہ پر علیحدہ ہونے
کے بعد بھی اتنا کام انجام دیتے تھے کہ کوئی دوسرا نوجوان اہلکار بھی ان کی ٹکر کو نہ
پہنچ سکتا تھا۔ پھر وہ جو بھی کام انجام دیتے سلیقہ اور سلجھے ہوئے انداز میں جن معاملات
میں دوسرے اہلکار عہدہ دار کے سامنے جاتے ڈرتے اور جھجکتے ان کی طرف سے
غلام محمد ذمہ داری سے نمائندگی کرتے اور اپنے نقطہ نظر کو پر زور طریقہ پر پیش
کرتے۔ ان کے بیان میں سادگی، خلوص اور ایقان ہوتا ہر کام کرنے والے کی
طرح وہ گفتگو کم کرتے اور ان کے چند جملے زیادہ وزنی اور کارآمد ہوتے غرض
جب کبھی میں نے غلام محمد سے گفتگو کی تو نئے خیالات ملے اور میں نے ان کی زندگی
اور کام کرنے کی لگن سے فائدہ اٹھایا۔ پھر راجہ ترمبک لعل کے زمانہ میں بھی اوقافی
جائیداد پر آپ کا تقرر کیا گیا جہاں آپ سے دفتر میں کام لیا جاتا رہا اور آپ کی دیرینہ

معلومات سے استفادہ حاصل کیا گیا۔ اس کے بعد جب مسلم وقف بورڈ کا قیام عمل میں آیا تو فروری ۱۹۵۵ء میں آپ کو دفتر مسلم وقف بورڈ منتقل کیا گیا۔ اور وہاں نواب سعید جنگ۔ مولوی اعظم الدین۔ مولوی عبدالرحیم۔ اور ڈاکٹر سید عبداللطیف کے تحت آپ ہنگامی اہلکار کی حیثیت سے کام انجام دیتے رہے اور اپنے تجربہ اور محنت سے نئے نظم و نسق کے لئے کارآمد ثابت ہوئے۔ ۱۹۶۵ء میں آپ بازمودہ خدمت سے بوجہ پیرانہ سالی سبکدوش ہوئے۔ اس طرح مولوی غلام محمد نے وظیفہ پر علیحدہ ہونے کے بعد بھی ۲۱ رسال تک ملازمت کی اور اپنی زندگی کے ۵۶ رسال نظم و نسق کی خدمت میں صرف کئے۔ اگر موصوف یورپ یا امریکہ میں پیدا ہوتے تو ان کی ڈائمنڈ جوبلی منائی جاتی اور ان کی شخصیت کو مثال بنا کر نوجوانوں کو اس سے فائدہ اٹھانے کے مواقع فراہم کئے جاتے۔ دفتری مصروفیات کے علاوہ غلام محمد قومی خدمات کے لئے بھی کچھ نہ کچھ وقت نکال لیتے رہے۔ انجمن احترام اوراق متبرکہ کے قیام سے آپ اس سے وابستہ رہے اور اس کے کارکن رہے ــــــ اسی طرح مسجد چوک میں ایک کتب خانہ بھی آپ نے قائم کیا ــــــ مدرسہ عظمت الاسلام بازار کوکہ سے بھی آپ کو دلچسپی رہی اور آپ اس کی ترقی کے لئے کوشاں رہے ــــــ آپ اس کی مجلس انتظامی کے صدر ہیں ــــــ مجلس انتظامی مکہ مسجد، مسجد چوک، مسجد ملا محی الدین ٹولی مسجد اور مسجد علی آقا حسینی علم کے معتمد کی حیثیت سے آپ نے قابل قدر خدمات انجام دیں ــــــ خاص طور پر آخر الذکر مسجد جو آپ کے مرشد حضرت عبداللہ

شاہ صاحبؒ کے نام سے مشہور ہے، اس کی آپ نے جی جان سے خدمت کی ــــــــ حضرت عبداللہ شاہ صاحبؒ سے آپ کو خاص عقیدت رہی اور زندگی کے اس دور میں آپ تزکیہ نفس کے لئے کوشاں ہیں اور پرسکون اور قانع زندگی گذار رہے ہیں ــــــــ

مثالی استاد

یہ میرا اپنا مشاھدہ ہے کہ انسان اپنی زندگی میں وہی اور وہ سب کچھ حاصل کرتا ہے جس کو حاصل کرنے کی صدق دل سے تمنا کرے۔ جب ایک عوامی وزیر نے اپنی ایک تقریر میں نہایت سادگی اور صفائی سے یہ اعتراف کیا تھا کہ ان کی زندگی میں تین خواہشات یہ تھیں کہ ان کے گاؤں کا پٹواری علیحدہ ہو۔ ان کی اپنی باؤلی پہ برقی پمپ نصب ہو اور ان کا اپنا گاؤں تحصیل کا مستقر بنے تو ان کی سادہ لوحی اور صاف بیانی نے مجھے چونکا دیا تھا کہ ایک عام انسان کیسی محدود خواہشات رکھتا ہے۔ لیکن خدا اپنے خاص بندوں کو ایسی توفیق بھی عنایت فرماتا ہے کہ وہ چھوٹی چھوٹی خواہشات سے بلند ہو سکیں۔

جب پروفیسر ہارون خاں شیروانی جن سے زائد از ربع صدی سے مجھے نیاز حاصل ہے۔ میرے نام اپنے ایک خط میں اپنی تین آرزوؤں کی یوں صراحت فرمائی کہ:۔

ا۔ سوائے خدا تعالے کے میں کسی کا دستِ نگر نہ ہوں اور نہ کسی پر بار رہوں۔ ۲۔ اپنے دم واپسیں تک خدائے تعالے اپنے نزدیک

مفید کاموں میں مجھے مصروف رکھے اور ۳۔ انجام بخیر ہو۔

تو موصوف نے غیر شعوری طور پر ان آرزوؤں کے ذریعہ اپنی شخصیت کا اظہار اور اپنی بڑائی کا اعلان فرمادیا۔

ایک راز کی بات بتادوں کہ پروفیسر ہارون خاں شیروانی سے میرا استاد اور شاگرد کا رشتہ ہے لیکن چوں کہ یہ رشتہ ۱۹۷۴ء میں نہیں بلکہ ۱۹۴۱ء میں قائم ہوا اس لئے استاد اور شاگرد کے رشتہ کے معنیٰ بھی مختلف ہیں۔ موصوف کے تعلق میرے دل میں بے پناہ جذبات عقیدت و احترام تو تھے ہی لیکن جذبات خوف بھی تھے۔ میں نہیں جانتا کہ یہ ۱۹۴۱ء کے دور کے اساتذہ کی کوئی خاص تیکنیک تھی۔ جس سے اس دور کے بے چارے اساتذہ قطعاً نا آشنا ہیں۔ یا ۱۹۴۱ء کے دور کے طالب علموں کی اس گُر سے ناواقفیت تھی جس سے دورِ حاضر کے طالب علم بفضلہ بخوبی واقف ہیں۔ لیکن میں بلاخوف تردید یہ کہہ سکتا ہوں کہ پروفیسر صاحب موصوف نے کسی قسم کی جسمانی یا ذہنی سزا دیئے بغیر اور تادیبی کارروائی یا درشتی سے پیش آئے بغیر اپنے شاگردوں کے دل میں کچھ ایسا خوف طاری کیا تھا جس کا اثر مدتوں باقی رہا اور مجھے یقین ہے کہ میرے تمام ساتھی میرے اس خیال کی تائید کریں گے۔

استاد شاگرد کے رشتوں کی اس تبدیلی کو اس دور کے ایک طالب علم کی حیثیت سے جیسے میں نے محسوس کیا۔ ویسے ہی اس دور کے ایک استاد نے بھی محسوس کیا۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب اپنی کتاب "یادوں کی دنیا" میں اسی صورت حال کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"آج ہماری درس گاہوں میں جو عام طور پر نظم و ضبط کا فقدان
ہے اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ گزشتہ پندرہ سولہ سال میں
استادوں کی پرانی پیڑھی کی جگہ نئی پیڑھی نے لے لی ہے۔
جسے اپنے کام سے جیسی دلچسپی ہونی چاہیئے ویسی نہیں ہے۔
دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ مذہب و اخلاق کی بندشیں ڈھیلی پڑ گئی
ہیں جس کے باعث نوجوانوں میں سرپھرا پن بڑھ گیا ہے ان کی
نظر میں کسی کا ادب ہے نہ لحاظ نہ اپنی علمی اور اخلاقی کوتاہیوں
کو دور کرنے کی خواہش..... ان استادوں میں سے
اکثر نے غلط پیشے کا انتخاب کیا ہے۔ ان کا دل اس میں نہیں اور
کہیں رہتا ہے اس لئے وہ بیکار ٹالتے ہیں انہی کوتاہیوں کو چھپانے
کے لئے پارٹی بازی میں پڑ جاتے ہیں اور طالب علموں کو غلط
امیدیں دلا کر اپنی سیاست میں مبتلا کرتے ہیں۔ انھیں طالب علموں
سے سچی ہمدردی نہیں ورنہ وہ ان کی اخلاقی اور ذہنی نشو و نما کی
طرف توجہ کرتے ہیں"

آج میں آپ کو ایک مثالی استاد کی زندگی کیسی ہوتی ہے اس کی ایک
جھلک پیش کروں گا۔ اس خاکہ کی جسارت کرنے کے لئے جس کا ارادہ ایک مدت
سے تھا مجھے اس وقت کا انتظار کرنا پڑا جبکہ عمر پچاس سال سے متجاوز ہو جائے
جس کے بعد میرا اپنا خیال ہے کہ سینیارٹی اور جونیارٹی یا بزرگی اور خوردی
کی سنگینی کم ہو جاتی ہے۔

اس وضاحت کے بعد جو در اصل اس بات کا اعتراف ہے کہ میں اپنے مختصر خاکہ میں اس عظیم شخصیت کے ساتھ پورا انصاف نہیں کر سکتا جس کی زندگی شاندار کارناموں اور عالمانہ سرگرمیوں کا مجموعہ رہی ہے اپنی طالب علمانہ جسارت کے لئے یقیناً قابل معافی قرار پاؤں گا۔

پروفیسر ہارون خاں شروانی جو خدا کے فضل سے قمری اعتبار سے اپنی عمر کے ۸۵ سال پورے کر چکے ہیں۔ ۳۰ مارچ ۱۸۹۱ء کو دتاؤلی ضلع علی گڑھ میں پیدا ہوئے۔ ایم۔ اے۔ او اسکول علی گڑھ، ہائی اسکول مرادآباد اور پیرا ڈائمنیائی اسکول لندن میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۱۱ء میں آکسفورڈ سے بی۔ اے آنرز اور ۱۹۱۲ء میں بار ایٹ لا کی تکمیل کی۔ آپ نے زمانۂ طالب علمی ہی سے جو کارنامے انجام دیئے اور جو اعزازات حاصل کئے ان کی طویل فہرست پر نظر ڈالی جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وطن کے پکے اس شخص نے اپنی زندگی کا ایک واضح پروگرام بنا لیا ہو۔ کام کا ایک باضابطہ لائحہ عمل تیار کر لیا ہو اور جلد جلد ایک ایک کام کو انجام دے رہا ہو کہ کوئی کام چھوٹنے نہ پائے۔ جب آپ آکسفورڈ یونیورسٹی میں طالب علم تھے تو ۱۹۱۰۔۱۱ء میں ایڈیسن کلب کے اور ۱۹۱۲۔۱۳ء میں لندن انڈین ایسوسی ایشن کے صدر رہے۔ ۱۹۱۵ء میں مسلم یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی کے رکن رہے۔ ۱۹۱۵ء سے ۱۹۱۸ء تک علی گڑھ ڈسٹرکٹ کانگریس کمیٹی کے اعزازی معتمد رہے۔ آپ انڈین نیشنل کانگریس کے لکھنؤ سیشن (۱۹۱۶ء) کلکتہ سیشن (۱۹۱۷ء) اور بمبئی اسپیشل کانگریس (۱۹۱۸ء) میں بحیثیت مندوب شریک ہوئے۔ ۱۹۱۷ء میں یوپی صوبائی کانفرنس کے مقامی معتمد رہے۔ ۱۹۱۷ء میں ہوم رول لیگ کے رکن رہے۔ ۱۹۱۹ء

میں جامعہ عثمانیہ میں اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے آپ کا تقرر عمل میں آیا۔ ۱۹۲۹ء میں آپ شعبۂ تاریخ اور سیاسیات کے شعبہ کے صدر مقرر ہوئے ۔ ۱۹۴۵ء میں نظام کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے آپ کا تقرر عمل میں آیا۔ ۱۹۴۶ء سے ۱۹۴۸ء تک آپ اینگلو عربک کالج دہلی سے وابستہ رہے اور ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۱ء تک جامعہ عثمانیہ میں شعبہ سیاسیات کے صدر رہے ۔

درس و تدریس کا رسمی سلسلہ ختم ہوا لیکن اس " ساٹھے پاٹھے " نے پوری توانائی علمی شغف اور لگن کیساتھ نہ صرف اپنے علمی کاموں اور سرگرمیوں کو جاری رکھا۔ بلکہ ان کو کافی وسعت دی ۔ اگر فی زمانہ کوئی یہ جاننا چاہے کہ علم کی خدمت کسے کہتے ہیں کام کی دھن کیا ہوتی ہے اور اپنے مضمون سے انصاف کیسے کیا جاتا ہے تو وہ پروفیسر ہارون خاں شیروانی کی زندگی، اور ان کے بے شمار کارناموں کو دیکھے جن میں ایک ایک کارنامہ ایک زندگی چاہتا ہے اور ایک ایک کارنامہ کو سرانجام دینے کے لئے ایک مدت درکار ہے اور یہاں یہ عالم ہے کہ . . . پروفیسر صاحب نے یہ معرکے ایسے سر کئے جیسے ان کا مطمع نظر ان سے بھی بلند ہو ایسے خاموشی سے جیسے کوئی اپنے عیبوں کو چھپاتا ہے ۔ وہ جب اپنے مطالعہ کے کمرے میں ہوتے ہیں تو ان کے انہماک اور محنت کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ گویا کوئی طالبعلم امتحان کی تیاری کر رہا ہے ۔ مطالعہ کے دوران کی سنجیدگی اور استغراق کو دیکھ کر کوئی اندازہ ہی نہیں لگا سکتا کہ یہ وہی شخصیت ہے جس کی بذلہ سنجی محفلوں کی زینت ہوتی ہے ۔

ایک مورخ اور تاریخ کے پروفیسر کی حیثیت سے آپ نے متعلقہ اداروں

سے اپنا ربط برابر قائم رکھا۔ ۱۹۳۸ء میں فرانس کے تاریخ انسٹی ٹیوٹ کے اعزازی کرسپانڈنگ رکن رہے۔ زیورک میں آٹھویں بین الاقوامی تاریخی۔۔۔ کانگریس منعقد ہوئی تھی تو آپ اس کے غیر یورپی شعبہ کے صدر تھے۔ ۴۵-۱۹۴۴ء کے دوران انڈین جرنل آف پولیٹکل سائنس کی مجلس ادارت کے رکن رہے۔ انڈین ہسٹری کانگریس سے آپ کا دیرینہ رشتہ رہا۔ ۱۹۴۱ء میں آپ اس کے مقامی سکریٹری ۱۹۴۴ء میں شعبہ عہد وسطیٰ کے صدر اور ۶۴-۱۹۶۳ء میں انڈین ہسٹری کانگریس کے صدر رہے۔ ۱۹۵۲ء میں انڈین پولیٹکل سائنس کانفرنس منعقد ہوئی تو آپ اس کے صدر مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۴ء میں دولت مشترکہ کی کانفرنس منعقد ہوئی تو ہندوستانی وفد میں آپ نے بحیثیت رکن شرکت کی۔ جامعہ عثمانیہ۔ مدراس یونیورسٹی، اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، کے کورٹ سینیٹ اور اکیڈمک کونسل کے مختلف اوقات میں رکن رہے۔

۶۳-۱۹۵۶ء کے درمیان آپ آندھرا پردیش کی پہلی لیجس لیٹو کونسل کے رکن نامزد کیے گئے۔ ۱۹۶۴ء میں ایشیائی تاریخ کی بین الاقوامی کانفرنس ہانگ کانگ میں منعقد ہوئی تو آپ نے ہندوستانی وفد کی قیادت کی۔

آپ "عہد وسطیٰ کی تاریخ دکن کے پراجیکٹ"، سے جس کو حکومت ہند اور حکومت آندھرا پردیش نے مشترکہ طور پر چالو کیا ہے ۱۹۶۴ء سے بحیثیت ایڈیٹر وابستہ ہیں۔ آپ ۱۹۶۹ء سے انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹاریکل اسٹڈیز کی مجلس عاملہ کے رکن ہیں۔ ۱۹۶۹ء میں آپ کو پدما بھوشن کا اعزاز ملا۔

آپ کی زائد از ۲۵ اہم تصنیفات ہیں ان کے علاوہ ۱۹۷ مضامین اور

مختلف کتابوں پر تقریباً ۰ء تبصرے اور ۲۰ نشریات ہیں۔ آپ جب بھی قلم اٹھاتے ہیں تو ذمہ داری کے ساتھ اٹھاتے ہیں اور مضمون کے ساتھ پورا انصاف کرتے ہیں۔

ان تمام کارناموں پر نظر ڈالیں تو ایک چیز صاف محسوس ہوتی ہے کہ آپ کے پیش نظر ایک نصب العین، اور مقصد ہے اور آپ کی زندگی میں ایک نظم اور سلیقہ ہے جس کے بغیر کاموں کا یہ پھیلاؤ اور حاصلات ممکن نہ تھے۔

گذشتہ سال "اردو الفاظ شماری" کے پیش لفظ کی تیاری کے سلسلہ میں میں نے آپ کا مشورہ حاصل کیا اس سلسلہ میں ایک کتاب کے حوالہ کی ضرورت ہوئی تو آپ اپنے کتب خانہ میں تشریف لے گئے اور ایک... منٹ میں مطلوبہ کتاب لے آئے۔ جس قرینہ و ترتیب سے آپ نے کتابوں کو رکھا ہے ویسے ہی زندگی کے ہر کام میں اصولوں کی پابندی اور ضبط ہے۔ آپ کی زندگی اور کارنامے ایسے ہیں جن پر ایک ملک کو ناز ہو سکتا ہے اور ایک دور فخر کر سکتا ہے۔ خدا آپ کو تا دیر سلامت رکھے۔

مردِ مومن

"میں کہ ڈاکٹر سید عبداللطیف ولد حضرت سید شاہ حسین صاحب مرحوم عمر ۸۰ سال پیشہ وظیفہ یاب پروفیسر جامعہ عثمانیہ ساکن مکان نمبر ۱۰-۴-۳ آغا پورہ حیدرآباد بہ ثبت ہوش و حواس اس دیرینہ دلچسپی کی بنا پر، جو مجھے قرآنی اور دیگر تہذیبی امور سے ہے ایک قرآنی ٹرسٹ قائم کرتا ہوں اور اپنی کتابوں کے حق تصنیف کو اس ٹرسٹ کے حوالے کرتا ہوں۔"

مندرجہ بالا تحریر پر عالم اسلام کو ناز ہو سکتا ہے اور اس کو غیر معمولی تاریخی اہمیت کا حامل قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس ٹرسٹ کو قائم کرنے والے نہ سرمایہ دار دولت مند نہیں لیکن اس خوش قسمت ٹرسٹ کو وہ سرمایہ حاصل ہوا ہے جس پر کوئی بھی تہذیب فخر کر سکتی ہے۔

یہ ایک مرد مومن کی داستان ہے۔ داستان ۸۰ سال کے عرصہ کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ جو دلچسپ بھی ہے اور سبق آموز بھی۔

ڈاکٹر سید عبداللطیف بتاریخ ۱۱ ستمبر ۱۸۹۱ء بروز جمعہ کرنول میں پیدا ہوئے

آپ کے جد امجد حضرت سید شاہ عبداللطیف قادری لاابالی کو جو حضرت یاہو بادشاہ کے نام سے موسوم ہیں جنوبی ہند کا قطب الاقطاب کہا جاتا ہے۔ ان کا سلسلہ نسب حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے توسط سے حضرت امام نقی علیہ السلام سے جا ملتا ہے۔ حضرت یاہو بادشاہ کا مزار مستقر کرنول پر مرجع خاص و عام ہے۔

عربی اور فارسی تعلیم ۱۲ سال کی عمر تک آپ کے والد ماجد حضرت سید شاہ حسین الحسینی صاحب کی نگرانی میں گھر ہی پر ہوئی۔ اس کے بعد آپ کو مقامی ہائی اسکول میں داخل کرایا گیا۔ بیسویں صدی کے ابتدائی دہے میں ہندوستان کے مسلمان علماء انگریزی کی مخالفت کر کر کے تھک چکے تھے۔ سرسید کی تحریک کی وجہ سے یہ مخالفت شمالی ہند میں کم ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر صاحب چونکہ والد ماجد کی اطلاع کے بغیر مدرسہ میں داخل ہوتے تھے اس لئے جب انھیں اس امر کی اطلاع ہوئی تو اس نفرت کی بنا پر جو آپ کو انگریزی تعلیم سے تھی، سخت برہم ہوتے اور... درشت لہجہ میں پوچھا۔ انگریزی پڑھ کر کیا کرے گا۔؟ دبلے پتلے پست قامت لڑکے نے جواب دیا۔ انگریزی پڑھ کر قرآن مجید کا ترجمہ اس زبان میں کروں گا۔

۱۹۱۰ء میں آپ نے امتحان میٹرک اور ۱۹۱۵ء میں بی۔ اے کا امتحان امتیاز سے پاس کیا۔ گریجویشن کی تکمیل کے بعد بیگن پلی نواب کے برادر میر اسد علی خاں رکن لیجسلیٹیو کونسل کے توسط سے آپ بیرنواب علی چودھری (محمد علی بوگرا سابق وزیر اعظم پاکستان کے دادا) کے پرائیویٹ سکریٹری مقرر ہوئے۔ ڈھاکہ سے آنے کے بعد آپ کو سرافسر الملک کی پیشی میں مقرر کیا گیا۔

جب پنج گنی میں اسکول قائم کیا گیا تو سید ابراہیم رحمت اللہ نے آپ کی انگریزی

قابلیت کے پیش نظر آپ کو اس مدرسہ کا پرنسپل مقرر کیا۔ دو سال تک آپ نے یہ خدمت انجام دی۔

۱۹۲۰ء میں جامعہ عثمانیہ میں انگریزی کے اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے آپ کا تقرر عمل میں آیا۔ ۱۹۲۲ء میں جامعہ عثمانیہ کے (۴) اسسٹنٹ پروفیسروں کو اپنے اپنے مضامین کی اعلیٰ تعلیم کے لئے یورپ کو بھیجنا طے پایا ان چار میں ڈاکٹر سید عبداللطیف خلیفہ عبدالحکیم اور پروفیسر وحید الرحمٰن شامل تھے۔ ریاستی حکومت نے چاروں کے مصارف تعلیم کے لئے ۲۰ ہزار روپے کا بلا سودی قرضہ منظور کیا اور تین سال کی تعلیمی رخصت بیافت نصف منظور کی گئی ریاستی حکومت نے بی۔ اے ... آنرز میں داخلہ کی کوشش کی تھی لیکن اس سال داخلہ نہ مل سکا۔ آپ تو اس خیال سے کہ آپ کے والد ماجد کی طبیعت علیل تھی۔ دوسرے سال جانے آمادہ ہو گئے مگر اپنے والد کے اصرار پر جانا پڑا۔ انگلستان پہنچنے کے بعد انگلستان کے کنگس کالج کے صدر شعبہ انگریزی اور دیگر اساتذہ آپ کی صلاحیت سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ آپ کو بی۔ اے اور ایم۔ اے سے مستثنیٰ کرتے ہوئے پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے کی اجازت دی گئی۔ چنانچہ "اردو ادب پر انگریزی ادب کے اثرات" آپ کے مقالہ کا عنوان طے پایا جس کی مدت تین سال مقرر کی گئی۔

اسی دوران جون ۱۹۲۳ء میں انگریزی کے پروفیسروں کی پہلی اینگلو امریکن کانفرنس میں کالج کے شعبہ انگریزی کے نمائندہ کی حیثیت سے آپ کو نیویارک بھیجا گیا۔ واپسی پر آپ نے دو سال ہی میں پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالہ کی تکمیل کر لی اور سربراہان کالج نے اس کو ڈاکٹریٹ کا مستحق قرار دیا۔ چنانچہ مقررہ مدت سے

ایک سال قبل ہی آپ حیدرآباد واپس ہوئے۔ جہاں آپ کو جامعہ عثمانیہ کا پروفیسر بنا دیا گیا۔

۱۹۳۷ء میں آپ نے وظیفہ حسن خدمت لے کر جامعہ عثمانیہ سے علیحدگی اختیار کی۔ تاکہ خاص علمی کاموں میں زیادہ وقت دے سکیں۔ دوسرے کاموں کے ساتھ ایک انگریزی رسالہ Clarion نکالنا بھی پیش نظر تھا اور اس کام میں خلیفہ عبدالحکیم بھی آپ کے ساتھ تھے۔ قاعدہ کے تحت سالم وظیفہ نہیں دیا جا سکتا تھا۔ ارباب جامعہ نے خاص مراعات ملحوظ رکھتے ہوئے تحریک کی۔ جب کارروائی سرکار نظام کے ملاحظہ میں پیش ہوئی تو اعلیٰحضرت نے نہ صرف سالم وظیفہ منظور فرمایا بلکہ اعلیٰ تعلیم کے سلسلہ میں دیئے ہوئے قرضہ کے منجملہ جو رقم ہنوز قابل وصول تھی اس کو بھی معاف فرما دیا اور اس طرح اپنی علم پروری کا ثبوت دیتے ہوئے اپنی رعایا کو دوام بخشا

ہندوستان کے تہذیبی اور ثقافتی نشو و نما میں مسلمانوں کا جو نمایاں اور قابل لحاظ حصہ رہا ہے اس کو عموماً نظر انداز کیا جاتا تھا۔ ڈاکٹر لطیف نے مسلمانوں کے ثقافتی Cultural مسائل پر ہمیشہ زور دیا اور یہی خواہش انھیں... سیاسیات کے میدان میں بھی لے گئی۔ چنانچہ آپ کے مقالے "ہندوستان میں مسلمانوں کی تہذیب" اور "ہندوستان کے تہذیبی منقطے" اپنا خاص انداز اور اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔ ان معرکۃ الآرا اور خیال انگیز مقالوں کو ملک کے ہر گوشہ میں پسند کیا گیا۔ مسلمانوں کی علیحدہ تہذیبی وحدت کو ملک میں تسلیم نہیں کیا جا رہا تھا۔ مسلم عوام اپنی علیحدہ تہذیب پر اصرار کر رہے تھے لیکن اس کو علمی انداز میں کسی نے بھی پیش نہیں کیا تھا اور کوئی ایسا نہ تھا جو قابلیت سے مسلم عوام کے جذبات اور احساسات کی صحیح ترجمانی کر سکے آپ نے اس کام کو انجام دیا۔ اور نہایت شاندار پیمانہ پر سرانجام دیا۔ ان مقالوں کے منظر عام پر آنے کے بعد قائد اعظم محمد علی جناح سے آپ کے

تعلقات بہت قوی ہو گئے ۔ قائداعظم جب حیدر آباد آتے تو آپ ہی کے ساتھ ٹھہرتے اور روز آنہ گھنٹوں آپ دونوں کی ملاقاتیں رہتیں آپ نے سیاست کا میدان دوسروں کے لئے چھوڑ دیا کیوں کہ آپ نے محسوس کیا کہ آپ اس کے لئے موزوں نہیں ہیں ۔ اس لئے آپ نے مختلف نقاط نظر کے سیاست دانوں کو مسائل سے واقف کرانے اور ان کو وقتاً فوقتاً ایک دوسرے سے قریب کرنے کی ... کوششیں کیں ۔ چنانچہ آپ نے رہنمایان ہند مثلاً مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو قائداعظم محمد علی جناح اور مولانا آزاد کے ساتھ خاموشی اور گمنامی میں جو کارنامے انجام دیئے وہ خود تاریخ ہیں ۔ ان کا احاطہ کرنا آپ کی تفصیلی سوانح حیات مرتب کرنے والوں کی ذمہ داری ہے ۔ آپ نے ہندوستان کے لئے ایک وفاقی دستور کی اسکیم رتب کی، نیز پاکستان کے قیام کے لئے جو مختلف خاکے مرتب کئے گئے تھے ان میں آپ کی ایک اسکیم بھی تھی جو "تہذیبی منطقوں کی اسکیم" کہلاتی ہے ۔

آپ نے جب محسوس کیا کہ مسلمانوں کے مسائل کی حقیقی ترجمانی مناسب طریقہ پہ نہیں ہو رہی ہے تو آپ نے ایک انگریزی ہفتہ وار رسالہ **Clarion** جاری فرمایا جسے مولانا محمد علی کے رسالہ "کامریڈ" کا درجہ دیا جا سکتا ہے ۔

جس طرح جنگ آزادی کے ظالمانہ ردعمل سے سرسید کی طبیعت اچاٹ ہو گئی تھی اور انھوں نے کسی اسلامی ملک میں جا بسنے کا ارادہ کر لیا تھا مگر آخر کار ان کو اپنا ارادہ بدل کر .... قوم کی آگ میں کودنا پڑا تھا بالکل اسی طرح پولس ایکشن کے بعد ڈاکٹر لطیف بھی ہجرت کر کے مدینہ طیبہ جانے کا مصمم ارادہ کر چکے تھے ۔ انھوں نے یہ ارادہ جس شان سے بدلا میں نے خود ان کو کہتے سنا ہے ۔

" ایک دن میں ایسے عالم میں تھا کہ جس کو نہ نیند کہا جا سکتا ہے نہ بیداری دیکھتا ہوں کہ روضۃ النبیؐ کے سامنے بیٹھا ہوں کہ ناگاہ ایک بزرگ میرے سامنے آکر کھڑے ہو گئے۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ سرورِ کائنات ہیں۔ میں نے عاجزی کے ساتھ بچکانہ آواز میں کہا " مجھے اپنے پاس بلاؤ" جواب ملا " یہاں آکر کیا کرو گے۔؟ تمھارا کام تو وہیں ہے "۔

چنانچہ آپ نے ہجرت کا ارادہ ترک کر کے اپنے کام کو ایک مشن قرار دے کر انہماک اور لگن کے ساتھ اس کی تکمیل اپنی زندگی کے آخری لمحات تک کی۔

پولس ایکشن کے بعد ڈاکٹر صاحب تین ماہ کے لئے پنچ گنی تشریف لے گئے۔ واپسی کے بعد ۱۹۵۰ء میں عثمانیہ کالج کرنول کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۲ء تک آپ اس خدمت پر فائز رہے۔ اسی سال مولانا آزاد کے تعاون سے آپ نے انسٹی ٹیوٹ آف انڈو مڈل ایسٹ کلچرل اسٹڈیز کی بنیاد ڈالی۔ مرکزی اور ریاستی حکومتوں نے مالی تعاون کیا۔ اس ادارہ کی جانب سے کم و بیش بہم مطبوعات شائع ہوئیں۔

۱۹۵۲ء میں ڈاکٹر صاحب کی معرکۃ الآرا تالیف " وہ ذہن جس کی قرآن نشوونما کرتا ہے ،، انگریزی میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب اسلامیات میں ایک نئی شاہراہ Land Mark کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کو ڈاکٹر صاحب کی جانب سے مغربی اقوام کے لئے ایک تحفہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اسلام کو مسلمانوں نے اس طرح پیش نہیں کیا جیسا کہ پیش کیا جانا چاہیے تھا۔ اس لئے اگر مستشرقین کے ذہن میں قرآن، اسلام یا مسلمانوں کے تعلق سے مخالفانہ خیالات موجود پائے جاتے ہیں تو ان کی مخالفت کا جواز نہ تھا۔

اس کتاب کی اشاعت کے بعد مستشرقین کے نقطہ نظر میں بیّن تبدیلی پیدا ہوئی اور عیسائی مشنریوں کی جانب سے اسلام کی مخالفت جس انداز سے کی جاتی تھی اس میں کافی نرمی پیدا ہوگئی۔ اسلامی تعلیمات کو اس کتاب میں اس بہتر طریقہ پر پیش کیا گیا ہے کہ مغربی ممالک کے علماء اس سے کافی متاثر ہوئے۔

انڈو مڈل ایسٹ کلچرل اسٹڈیز کے ذریعہ جو علمی خدمات انجام پائیں اس کے نتیجہ کے طور پر ڈاکٹر صاحب مولانا ابوالکلام آزاد سے بہت قریب ہوگئے۔ مولانا نے ۱۹۵۴ء میں ڈاکٹر صاحب کو اس بات پر آمادہ کیا کہ ان کی مشہور و معروف کتاب ترجمان القرآن کو انگریزی زبان میں منتقل کریں۔ ترجمہ کی سنگلاخ زمین میں طبع آزمائی ڈاکٹر صاحب ہی کا حصہ تھی اور مولانا آزاد کی اعلیٰ معیار کی زبان اور اونچے علمی انداز بیان کو انگریزی میں منتقل کرنا ہر کسی کے بس کا روگ نہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب ۴ سال تک یعنی مولانا آزاد کے انتقال تک کئی بار ان کے پاس آتے جاتے رہے۔ چنانچہ مولانا آزاد کے انتقال کے وقت بھی ڈاکٹر صاحب ان کے ہاں مقیم تھے اس طرح آپ نے ۱۹۵۸ء میں اس مشکل لیکن اہم کام کی تکمیل کی۔ ایشیا پبلشنگ ہاؤس بمبئی کی جانب سے اس کتاب کے ابتدائی دو حصوں کی اشاعت عمل میں آچکی ہے۔ تیسرا حصہ ابھی شائع نہیں ہوا پبلشرز کی جانب سے غیر ضروری تاخیر کی جارہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو اکثر اس بارے میں تاخیر کی شکایت کرتے سنا گیا۔

ترجمان القرآن کا جو مقام ہے وہ تو مسلمہ ہے۔ مگر ڈاکٹر صاحب نے اپنی انگریزی دانی اور تبحر علمی کی بنا پر انگریزی ترجمہ کو جو مستقل کارنامے کی حیثیت

دی ہے اس پر بھی اسلامیات کو فخر ہو سکتا ہے ۔

ڈاکٹر لطیف کی زندگی کا سب سے اہم کارنامہ دنیا کی سب سے بڑی زبان یعنی انگریزی میں قرآن مجید کا ترجمہ ہے ۔ آپ نے اپنی زندگی کے قیمتی لمحات اسلامیات کی نذر کئے اور قرآن کو ایک خاص انداز سے انگریزی روپ دیا، تاکہ دنیا کے زیادہ سے زیادہ ... انسان اس کے نور سے مستفید ہو سکیں ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس خوش نصیب عالم دین کی ساری زندگی اس کام کی تکمیل کی تیاری میں گذری ۔

واقعی خدا اپنے بعض بندوں کو کس کس طرح نوازتا ہے اور کیسے کیسے بلند مقام عطا کرتا ہے ۔ انگریزی میں قرآن مجید کا ترجمہ کرنے کی توفیق دینے سے پہلے خدا نے انھیں انگریزی زبان کا مسلمہ اور مستند عالم بنا دیا ۔ دنیا سے اس کا اعتراف کروالیا ۔ پھر ساتھ ہی ساتھ اسلامیات میں ان کو نہ صرف ایک بلند مقام دیا گیا بلکہ ان کو بلند نظری بھی دی گئی اور قرآن شریف کا ترجمہ کرنے سے پہلے ان سے "وہ ذہن جس کی قرآن نشو و نما کرتا ہے"، جیسی معرکۃ الآرا اور خیال انگیز کتاب لکھوا کر تمام دنیا سے ان کی قابلیت کا سکہ منوالیا ۔

بہر حال ڈاکٹر لطیف کا ترجمہ قرآن ایک خاص مقام رکھتا ہے اور اس کو اس کے قبل کے سارے ترجموں میں ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے ۔ یہ لفظی ترجمہ نہیں ہے بلکہ قرآن کی روح کو انگریزی زبان سے مربوط کیا گیا ہے ۔

میں ڈاکٹر صاحب کے اس انگریزی ترجمہ قرآن پر تبصرہ لکھ رہا تھا ۔ وہ منظر بیان کر رہا تھا ۔ جب کہ مکہ مسجد میں ۱۵ ردسمبر ۱۹۶۸ء کو انگریزی ترجمہ قرآن کی

رسم اجرا مقرر تھی اور میں اس عظیم الشان کارنامہ (انگریزی ترجمہ قرآن) کے مضمرات کو سامنے رکھ کر اس خراج عقیدت سے جو پیش کیا گیا ہزار گنا زیادہ دیکھنے کے لئے بے چین تھا میں جب اس منظر کو دیکھنے سے محروم رہا تو میں نے لکھا۔ آخر ہم اس ۸۰ سالہ بوڑھے قلندر کو جس کو خدا نے دنیا کی سب سے بڑی زبان میں اپنے پیام کا ترجمہ کرنے کی سعادت دی ہے، دے ہی کیا سکتے ہیں سوائے جذبات تحسین و عقیدت کے لیکن ہم سے یہ بھی خاطر خواہ نہ ہو سکا۔"

ڈاکٹر لطیف اور ڈاکٹر سر محمد اقبال کے بھی قریبی تعلقات تھے۔ اور اونچی سطح پر ہر دو میں کافی بحث و مباحثہ رہتا تھا۔ ڈاکٹر اقبال کے قلمی خطوط جو میں نے ڈاکٹر صاحب کے پاس دیکھے ہیں ان میں ایسے مباحث موجود ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی شان بے نیازی ان اہم خطوط کو منظر عام پر لانے میں مانع رہی۔

ڈاکٹر اقبال کے انتقال کے موقعہ پر ان کے پرائیویٹ سکریٹری مسٹر محمد شفیع، ڈاکٹر لطیف کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"ڈاکٹر صاحب باور کیجئے علامہ (ڈاکٹر اقبال) مرحوم کے دل میں آپ کی خاص وقعت تھی جو گہری محبت اور والہانہ خلوص کی شان رکھتی تھی جب کبھی موقع آیا مرحوم آپ کو ایک وسیع النظر فاضل کے نام سے یاد کیا کرتے تھے۔ وہ اس فکر میں تھے کہ اپنے مجوزہ شعبہ اسلامیات کی ڈائرکٹری کے لئے آپ کو یہاں بلائیں۔ عزیزم محترم! آپ نے اپنا ایک محب صادق کھو دیا اور اس سے آپ کو ذاتی طور پر جو نقصان پہنچا مجھے اس سے دلی ہمدردی ہے۔"

اسی طرح حیدرآباد کے عالم دین وصوفی بزرگ مولانا عبدالقدیر صدیقی حسرت سے آپ کے تعلقات ۱۹۲۰ء سے یعنی اس وقت سے رہے جب آپ جامعہ عثمانیہ سے منسلک ہوئے۔ مولانا عبدالقدیر کا تعلق .. شعبہ دینیات جامعہ عثمانیہ سے تھا۔ یہ تعلقات مولانا عبدالقدیر کے انتقال تک رہے۔ مولانا آپ کے خیالات وسیع النظری اور آزادانہ مسلک کی قدر کرتے اور اسی طرح ڈاکٹر صاحب نے بھی مولانا سے کافی استفادہ کیا یہ اتحاد اسلامیات کے لئے کافی اہمیت رکھتا ہے۔

ڈاکٹر لطیف کے ہمعصر علمائے اسلامیات، دو طبقوں میں منقسم ہیں۔ ایک طبقہ قدامت پسند مسلمان علما کا ہے جس کو علمائے تقلید کہہ سکتے ہیں اور دوسرے ....

جو ہر مسئلہ میں نئے نقطۂ نظر کو پیش کرنا چاہتے ہیں۔ جب ڈاکٹر صاحب نے احادیث کے مجموعہ پر نظر ثانی کرنے کی انقلاب آفریں تحریک پیش کی تو اس پر کفر کے فتوے صادر کئے جاتے تو باعث حیرت نہ تھا لیکن ڈاکٹر صاحب نے ایسا انداز اختیار کیا تھا کہ مولانا عبدالقدیر صدیقی جیسے مسلمہ عالم دین کی سند توثیق حاصل ہوئی۔

اسلامیات میں اب وقت کا سب سے بڑا تقاضہ یہ ہے کہ دو متضاد نقطۂ نظر رکھنے والے مکاتب خیال کے درمیان نقطۂ اتصال پیدا کیا جائے۔ توقع ہے کہ بہت جلد اس ضرورت کے مضمرات کو پوری طرح محسوس کیا جائے گا۔ اور جلد ایسے عالم پیدا ہوں گے۔ جب کبھی ایسا ہوگا تو ڈاکٹر سید عبداللطیف کو یقیناً اس مقدس کام کے امام یا پیش رو کی حیثیت دی جائے گی۔

ڈاکٹر صاحب بیک وقت ایک بڑے عالم بھی تھے اور ایک ادارہ بھی۔ ان

کے اطراف ہمیشہ ان کے شاگردوں اور ہاتھ بٹانے والوں کا ہجوم ہوتا۔ ہر ایک کی ہمت افزائی کرتے اور ہر ایک کو ضرورت محسوس ہونے پر تنبیہہ کرتے، ٹوکتے بلکہ اظہار خفگی بھی کرتے ان کی زندگی کے آخری ایک ماہ پر نظر ڈالی جائے تو وہ اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "دہ ذہن جس کی قرآن[1] نشو ونما کرتا ہے" کی نظر ثانی فرماتے نظر آتے ہیں۔ انڈو مڈل ایسٹ کلچرل اسٹڈیز کی جانب سے قومی یکجہتی پر مقالات کا مجموعہ شائع ہو رہا ہے تو ڈاکٹر صاحب اس بارے میں ہماری رہبری فرماتے نظر آتے ہیں روزانہ رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری تھا۔ علمی اور تصنیفی کاموں کے نقشے بن رہے تھے۔ آنے جانے والوں سے ان کی صلاحیت اور دلچسپی کے بموجب کام لیا جاتا رہا۔ ان تمام کاموں میں ان کے ساتھ کام کرنے والے نوجوانوں سے بھی زیادہ اگر کوئی ایک شخص تمام تفصیلات سے واقف تھا اور مستعد تھا تو وہ خود ڈاکٹر صاحب تھے۔ میں نے حال ہی میں ایک نشری تقریر میں کہا تھا "دن بھر تو قید مجلس مال رہتا ہوں لیکن جب دفتر کا کام ختم کر کے آغا پورہ کے مکان نمبر ۱۹ کو جاتا ہوں تو اس وقت میری حیثیت سرکاری عہدہ دار کی نہیں بلکہ ایک طالب علم کی ہو جاتی ہے۔ اور ڈاکٹر سید عبداللطیف کے عالمانہ اور حکیمانہ ارشادات کو طالب علمانہ انہماک سے سنتا ہوں۔ میرے ساتھ دوسرے طالب علم بھی ہوتے ہیں جن میں ڈاکٹر، عہدہ دار، لکچرر، پروفیسر اور مشائخین شامل ہیں۔ جب ڈاکٹر لطیف اپنی علالت کے باوجود کسی خاص مسئلہ یا کسی موضوع پر گفتگو فرماتے ہیں تو ان کے افکار کی بلندی

---

[1] دوسرے ایڈیشن کی اشاعت کی سعادت مجھے حاصل ہوئی۔

کو دیکھ کر مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ابن سینا، ابن رشد، امام غزالی مولانا روم، جمال الدین افغانی، ڈاکٹر اقبال یا دوسرے علماء اور مشاہیر عالم میں سے کسی کی باتیں سن رہا ہوں۔"

ڈاکٹر لطیف تمام اعزازات یا ساری زندگی کے کارناموں کے اعتراف سے مستغنی اور بے نیاز رہے۔ وہ کبھی دنیا کے طلبگار نہیں ہوئے اور اپنی زندگی ایسی گزاری کہ "بازار سے گزرا ہوں خریدار نہیں ہوں"۔ انھوں نے سچ کہتے ہوئے اس مصلحت کو درمیان میں نہ آنے دیا کہ لوگ کیا کہیں گے۔

مردِ مومن کی شان ڈاکٹر صاحب کی زندگی میں ہمیشہ جلوہ فرما رہی۔ ابھی کچھ دن کا ذکر ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے جن کو طویل علالت کے دوران کسی تکلیف کی شکایت کرتے کبھی نہیں دیکھا گیا۔ ایک رات غیر معمولی تکلیف اور بے چینی میں گزاری۔ صبح انھوں نے اپنے ملنے والوں سے اس انداز میں فرمایا "گذشتہ رات میں نے اس سے (خدا سے) پوچھا آخر کیوں تو نے مجھے اس آزمائش میں ڈالا ہے کیا زندگی بھر کی آزمائش کافی نہ تھی۔؟"

ایک مردِ مومن ہی یہ کہہ سکتا ہے۔ جس کو زندگی بھر یہ احساس رہا ہو کہ دنیوی زندگی ایک آزمائش ہے۔

کسی انسان کے کردار کا صحیح جائزہ ان لمحات ہی میں کیا جا سکتا ہے۔ جن کو وہ آخری لمحات تصور کرتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب مرض کی نوعیت اور اس کے مضمرات کو خوب سمجھتے تھے اور ان لمحات میں مسلسل ان کی بڑائی کا اظہار ہوتا رہا۔ عالی حوصلگی، مذہبی رواداری، دوسروں کے خیالات، اور نظریات کا احترام،

کو ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کا امتیازی پہلو قرار دیا جا سکتا ہے ۔ وہ ایک جید عالم، مفکر، مجتہد اور آزاد منش کی حیثیت سے مشہور اور ایک جامع شخصیت کے مالک تھے ۔ نیکی خلوص، محبت، ہمدردی، علمی خدمات، سادگی آپ کا وطیرہ تھیں ۔

ڈاکٹر صاحب کی سب سے آخری خدمت جو انھوں نے دینی علوم کی ترویج کے لئے انجام دی، قرآنی ٹرسٹ کا قیام ہے ۔ جس کا اشارہ اس مضمون کی ابتدار میں کیا گیا ہے ۔ ڈاکٹر صاحب نے چند روز قبل اس ٹرسٹ کو ۲۰ ہزار روپیہ کی گرانقدر رقم حوالہ فرمائی ۔

۴ر نومبر ۱۹۷۱ء کو بوقت ۵ ۱/۲ ساعت صبح اس بلند پایہ مفکر اور عالم نے اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کی ۔

استاد خطاطی

عربی رسم الخط نے خوشنویسی کے فن کو بے انتہا ترقی دی ہے۔ دنیا کا کوئی رسم الخط اتنا زیادہ خوشنما نہیں جتنا کہ عربی رسم الخط ہے۔ طباعت کی ترویج سے قبل کتابوں کو ہاتھ سے لکھا جاتا تھا اور یہ کام ہمیشہ خوشنویسوں نے انجام دیا مسلمانوں نے علوم وفنون کی ترویج کا جو شاندار کام انجام دیا اس میں خوشنویسوں کا بھی حصہ رہا۔ چنانچہ مسلمانوں کی تاریخ کے ہر دور میں خوشنویس تھے اور حکومت کی سرپرستی انھیں حاصل رہی۔ عوام بھی اس فن کو ہمیشہ قدر کی نگاہوں سے دیکھتے رہے اور خوشنویسوں کی ہمیشہ عزت کی گئی۔ ادھر چند سال سے اس فن کی جانب توجہ کم ہو رہی ہے اور خوشنویسوں کی تعداد بھی کم ہو رہی ہے۔ پھر بھی لیتھو کی طباعت کی وجہ سے یہ فن موجود ہے۔ موجودہ دور کے خوشنویسوں کی صف اول میں جابر صاحب کا شمار کیا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ موصوف کو اس فن میں استادی کا درجہ حاصل ہے

جابر صاحب کا تعلق جنوبی ہند کے مشہور خاندان اہل نائط سے ہے اور آپ کا سلسلۂ نسب حضرت جدھر علیہ الرحمۃ سے ملتا ہے۔ آپ حیدرآباد کے مشہور شاعر و ادیب نواب عزیز جنگ ولاؔ کے چچا محمود نواز خاں صاحب کے نواسہ ہیں جن کی رحلت پر حضرت ولاؔ نے حسب

ذیل تاریخ لکھی ہے ۔

چو عم بندۂ افسردہ خاطر　　قدم در جنت الماوا ہند ا
پے سال شش را او والا گفت　　الٰہی عاقبت محمود ـــــ بادا
۱۲۱۷ ہجری

جابر صاحب کے والد عبدالسلام صاحب فن خطاطی سے دلچسپی رکھتے تھے ۔

جابر صاحب ۱۳۰۲ ف میں پیدا ہوئے ۔ آپ کی ابتدائی تعلیم مدرسہ دارالعلوم میں ہوئی ۔ اس کے بعد فارسی اور عربی تعلیم خانگی طور پر ہوئی اس کے ساتھ ساتھ خطاطی کا شوق بھی ہوا ۔ اس زمانہ میں حیدرآباد میں نامی گرامی خطاط موجود تھے آپ نے جواہر رقم سے خط نستعلیق میں شاگردی حاصل کی ۔ خط ثلث و نسخ میں شیخ طہار سے جو عدالت العالیہ کے خوشنویس تھے، اصلاح لی ۔

جابر صاحب کا ابتدائی تقرر محکمہ روڈ رگیری میں ۱۳۲۶ ف میں ہوا جبکہ آپ کی عمر ۲۴ رسال تھی پھر ۱۳۲۹ ف میں نظامت کوتوالی میں جائیداد خوشنویس منتقل عمل میں آئی ۔ فروری ۱۳۳۲ ف میں آپ کو دارالطبع کی اسکیم میں (۵۰ تا ۷۰) کی جائیداد پر منتقل کیا گیا ۔ اس محکمہ میں ہمیشہ اہم اور خاص کام جنتری اور فرامین کی کتابت آپ سے متعلق رہی ۔ دارالطبع میں ۱۳۴۰ ف میں صیغہ آفسٹ قائم ہوا تو جابر صاحب سے اس صیغہ میں کام لیا جانے لگا ۔ ۱۹۳۲ء میں غلام یزدانی صاحب ناظم آثار قدیمہ نے مولانا روم کی مثنوی شائع کروائی تھی ۔ اس کا مقدمہ جابر صاحب سے لکھوایا مثنوی کا یہ ایڈیشن جو اس وقت تاریخی حیثیت رکھتا ہے اعجاز رقم مرزا عبدالکریم (میر عماد حسینی کے پڑپوتے) کی قلمی کتاب سے مطبع ریکاں میونخ میں مونوٹائپ کے ذریعہ شائع ہوا اس کے مقدمہ میں جابر صاحب نے اپنی استادانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے اور خط نستعلیق کا

بہت ہی بلند معیار پیش کیا ہے ۔ ان کے خط میں لطافت و پاکیزگی موجود ہے جس طرح خط نستعلیق میں میر عماد اپنے پیش رو میر علی سے بازی لے گئے تھے اسی طرح اگر یہ کہا جائے کہ محمد جابر صاحب مثنوی کا مقدمہ لکھ کر اصل قلمی کتاب کے کاتب اور فن خوشنویسی کے ایک مسلم استاد مرزا عبد الکریم سے بازی لے گئے ہیں تو کوئی مبالغہ نہیں ہے اور مثنوی مولانا روم کا یہ ایڈیشن اس بیان کی تصدیق کے لئے کافی ہے ۔

اسی طرح غلام یزدانی صاحب کی تصنیف اجنٹہ کی نقاشی کی کتابت بھی جابر صاحب نے کی ہے ۔ اس کتاب کا خط بھی نہایت دیدہ زیب اور نفیس ہے ۔ ۱۹۳۴ء میں آصف جاہ اول کے دو دیوان دار الطبع میں طبع ہوئے تو ان کی کتابت بھی جابر صاحب نے کی ۔ ان میں بھی آپ نے خط نستعلیق میں اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے ۔ ۱۹۴۵ء میں آپ کو توالی بلدہ میں منتظمی پریس پر منتقل ہوئے ۔ اور ۱۹۴۷ء میں آپ کو منتظمی درجہ اول پر ترقی ملی اور ۱۹۴۹ء میں آپ وظیفہ حسن خدمت پر علیحدہ ہوئے ۔ اس وقت آپ سالار جنگ میوزیم کے کتب خانہ میں کام کر رہے ہیں ۔ ۱۹۶۰ء میں ڈاکٹر شہر وون ناظم کیوریٹر گریٹ کلکشن ، جب حیدرآباد تشریف لائے تھے تو جابر صاحب کے فن سے واقف ہو کر اپنی خوشنودی کا اظہار کیا ، اور ان کو ملک الخطاطین کا لقب دیا اسی طرح اشرن بینٹ سمتھ (اعزازی مشیر لائبریری آف کانگریس) نے آپ کو قلم کے جادوگر سے مخاطب کیا ۔

۱۹۵۸ء میں نواب مہدی نواز جنگ گورنر گجرات کی دلچسپی سے سالار جنگ میوزیم میں قدیم و جدید مخطوطات کی نمائش ہوئی تھی تو اس میں جابر صاحب کو انعام اور سند عطا کئے گئے ۔ آپ اپنے فرصت کے اوقات میں خطاطی کی مشق کرتے ہیں اور یہ سلسلہ

اب بھی جاری ہے۔ نستعلیق، ثلث اور نسخ کے علاوہ خط شکست، رقاع، زلف عروس، طغرا، ریحان بہاری، تعلیق، شفعہ، غبار اور کوفی میں بھی آپ کو مہارت حاصل ہے اور ہر خط میں آپ کے اعلےٰ نمونے موجود ہیں اسی بنا پر آپ کو فن خوشنویسی کے استاد کا درجہ حاصل ہے نستعلیق جلی میں آپ کو انفرادی حیثیت حاصل ہے ۔

جابر صاحب کا فن تعارف سے بے نیاز ہے لیکن تشریح کا محتاج ہے ۔ اس فن کو سمجھنے اور اس کی خوبیوں سے لطف اندوز ہونے کے لئے واقفیت کی ضرورت ہے ۔ خوشنویسی کا فن ہماری روایات میں داخل ہے ۔ اس لئے جابر صاحب ہماری روایات کی ترجمانی کرتے ہیں ۔ موصوف مخصوص انفرادیت کے مالک ہیں ۔ ان کے خط کی دلکشی ہمارے دل کی گہرائیوں میں اتر جانے پر قادر ہے ۔ آپ کے قلم کے شاہکار ہمیشہ باقی رہیں گے ۔ اور آنے والی نسلیں ان پر فخر کرسکیں گی ۔

ماہر نظم و نسق

میرے والد نواب دین یار جنگ ۲۶ ستمبر ۱۸۹۲ء کو بمقام جلیل منزل محلہ سلطان پورہ پیدا ہوئے۔ اس وقت تک عزیز باغ تعمیر نہیں ہوا تھا۔ اور موجودہ جلیل منزل ہمارا خاندانی مکان تھا۔ آپ شمس العلماء نواب عزیز جنگ ولاؔ کے تیسرے صاحبزادے تھے۔ میری دادی مولوی عبدالقدوس صاحب چیدہ کی دختر تھیں اور میرے والد ان کے سب سے بڑے فرزند تھے۔ آپ کی ابتدائی تعلیم دادا صاحب کی نگرانی میں گھر پر ہوئی۔ اس کے بعد آپ نے مدرسہ اعزہ اور نظام کالج میں تعلیم پائی۔ امتحان مال سے فارغ ہونے کے بعد ضلع بلاری میں محکمۂ مال کا عملی تجربہ حاصل کیا۔ اور روایسی پر معتمدی مال میں بحیثیت مددگار اعزازی کام انجام دیا۔ ۱۹۱۹ء میں آپ کی شادی ہوئی۔ میرے نانا ڈاکٹر فقیہہ الدین حسین خاں کا سلسلہ خان عالم خاں فاروقی سے ملتا ہے جو نواب انور الدین خاں شہید نواب ارکاٹ کے خاندان سے تھے۔ ۱۹۱۹ء میں سوم تعلقداری پر آپ کا تقرر عمل میں آیا۔ سر علی امام کے زمانہ صدارت عظمیٰ میں عدلیہ اور عاملہ کی علیحدگی عمل میں آئی تو آپ کی خدمات عدالت میں حاصل کی گئیں۔ عدالت میں آپ نے بحیثیت ناظم عدالت دیوانی و فوجداری بلدہ کام کیا۔ اس کے

بعد آپ کا تبادلہ بحیثیت منصف عدالت تلنگٹہ عمل میں آیا۔ میں بھی اس وقت ساتھ تھا اور ابتدائی تعلیم کا آغاز یہیں ہوا۔ اضلاع عثمان آباد و ناندیڑ میں بھی آپ بحیثیت ناظم عدالت ضلع کارگذار رہے۔ اس کے بعد ۱۹۲۹ء میں آپ کی منتقلی سررشتہ مال میں عمل میں آئی اور جالنہ کی دوم تعلقداری پر آپ کا تقرر کیا گیا۔ جالنہ میں آپ تین سال سے زیادہ رہے اور اپنی انتظامی قابلیت اور رفاہ عام سے دلچسپی کا ثبوت دیا آپ کے دور میں آبرسانی کے اغراض کے لئے تالاب تعمیر ہوا اور بقول حضرت جلیلؔ سرسبز ہو کے جالنہ گلزار ہو گیا آپ کے دور دوم تعلقداری میں اعلیٰ حضرت حضور نظام جالنہ تشریف لائے تھے تو آپ کی انتظامی قابلیت کا اعتراف فرماتے ہوئے اپنے قلم سے اظہار خوشنودی فرمایا۔ اس کے بعد اورنگ آباد اور ناندیڑ پر آپ بحیثیت منصرم اول تعلقدار کارگذار رہے۔ اس زمانے میں جب کہ آپ ناندیڑ میں تھے اعلےٰ حضرت حضور نظام نے نظامت امور مذہبی کے لئے آپ کا انتخاب فرمایا یکم آذر... ۱۳۴۵ف م ۱۹۲۵ء کو آپ نے نظامت امور مذہبی کا جائزہ نواب اختر یار جنگ فرزند امیر مینائی سے حاصل فرمایا۔ آپ نے سررشتہ امور مذہبی میں بہت سی اصلاحات کیں اور وقف جائیدادوں کی تنظیم جدید کی، آپ کے دور نظامت میں دستورالعمل قواعد اوقاف مدون ہوئے۔ جو اسوقت تک بھی مثالی حیثیت رکھتے ہیں۔ ۱۹۴۱ء تا ۱۹۴۴ء والد صاحب کل ہند درگاہ کمیٹی اجمیر کے صدر رہے اور حکومت حیدرآباد کی نمائندگی کی۔

اس کے بعد ۱۹۴۴ء میں والد صاحب کی منتقلی سررشتہ کوتوالی میں عمل میں آئی اور آپ کو ٹریننگ کے لئے بمبئی روانہ کیا گیا۔ اور ٹریننگ ختم کرنے کے بعد آپ

نے نواب رحمت یار جنگ سے کوتوالی بلدہ کا جائزہ حاصل کیا ۔ ۱۹۴۷ء میں برطانوی اقتدار کی منتقلی کے بعد آپ کو ڈائرکٹر جنرل پولیس کے عہدہ پر ترقی دی گئی اور . . . اینڈرسن سے آپ نے جائزہ حاصل کیا ۔ اس سے قبل کوتوالی بلدہ ۔ کوتوالی اضلاع اور ریلوے پولس علیحدہ علیحدہ تھے ۔ والد صاحب کے تحت پہلی مرتبہ تینوں کو یکجا کیا گیا آپ نے نہایت تدبر و فراست سے کوتوالی کا انتظام کیا ۔ خود کو سیاست سے الگ رکھا اور صرف خدمت کو اپنا شعار بنایا ۔ پولس ایکشن کے بعد جنرل چودھری کی کابینہ میں کوتھالی ومال کے قلمدان ہائے وزارت والد صاحب کو تفویض ہوئے ۔

اعلیٰ حضرت حضور نظام سے والد صاحب کو بے پناہ عقیدت رہی ۔ ۱۹۴۷ء میں آزاد حیدرآباد کے نام پر حیدرآباد میں ایک خاص طبقہ نمودار ہوا ۔ محدود قابلیت کی مخلوق کے ہاتھ میں اقتدار کی باگ ڈور آئی ۔ ایک مخصوص اور عجیب و غریب ذہنیت سامنے آئی ۔ سنجیدگی ۔ محنت ۔ خلوص ۔ دیانت اور ایسی ہی دوسری صفات عوامی زندگی میں یکسر مفقود ہوگئیں ۔ قابلیت کے دام کم ہوگئے ۔ اس کی مانگ بھی کم ہوگئی آسان دولت اور سستی شہرت کی خواہش عام ہوگئی اس غیر صحت مند ماحول نے حیدرآباد میں بہ استثنائے چند ہر ایک کو متاثر کیا ۔ اگر یہ کہا جائے کہ والد صاحب ان چند مستثنیات میں سے تھے تو بے جا نہ ہوگا ۔ اس کے بعد طوفان آیا قرآن کی زبان میں وہ وقت آیا جب کہ معمولی لوگ ٹڈیوں جیسے پراگندہ ہوگئے اور بڑے بڑے غیر متزلزل چٹان دھنی ہوئی روئی کے مانند بے وزن ہوگئے ۔ لیکن والد صاحب اور سرکار نظام کا رشتہ نہ ٹوٹا اور وہ بے چینی جو جلتی آگ کے مانند ہوتی ہے اس سے والد صاحب قید و بند کی مشکلات کے باوجود بچے رہے ۔ وہ اپنی جگہ مطمئن رہے

اور گردش لیل و نہار دیکھتے رہے۔ ایک جگہ حضور نظام کو لکھتے ہیں ۔

" یہ ایک آزمائش کا زمانہ تھا جب کہ اس کی (خود کی) آزمائش ہوئی۔ اور اس نے دوسروں کی بھی خوب آزمائش کی اور ہوا کے بندوں کو خوب آزمایا۔"

پولس ایکشن کے بعد والد صاحب کے خلاف طرح طرح کی سازشیں ہوئیں اور کچھ عرصہ تک بے بنیاد اور فرضی الزامات کی دریافتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ والد صاحب نے دورانِ ملازمت جس اعلیٰ درجہ کی احتیاط کو اپنا وطیرہ بنایا تھا وہ ان غیر معمولی حالات میں کارآمد ثابت ہوا۔ صرف ایک مثال پر اکتفا کروں گا۔ بحیثیت صدر ناظم کوتوالی والد صاحب کو حکومت سے ایک معتدبہ رقم سیکریٹ فنڈ کے نام سے ملتی تھی۔ جو حسابی تنقیح سے مستثنیٰ تھی۔ والد صاحب اس رقم سے جب بھی صرف کرتے محض احتیاط کے پیش نظر اس کے حسابات بھی اپنے پاس رکھتے جب ان کے خلاف دفتر سے اور کوئی شکایت ثابت نہ ہوسکی تو اس فنڈ کے سلسلہ میں بھی دریافت کیا گیا اور اس کے حسابات بھی پیش ہوئے تو معاملہ ختم ہوا۔ ایک اعلیٰ عہدہ دار نے حد درجہ صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے والد صاحب سے کہا "نواب صاحب ہم نے ہر طرح کوشش کی۔ کوئی الزام آپ سے چپکتا نہیں ہے" والد صاحب نے فرمایا "آپ پوری کوشش کریں کوئی ارمان باقی نہ رکھیں "

دیانت اور روفاداری سے فرائض انجام دینے والے سرکاری ملازم کو ملازمت کی آخری منزل پر ایسی عجیب صورت حال سے دوچار ہونا پڑے تو اس کے دل و دماغ پر کیا گزرے گی۔ والد صاحب نے اس مصیبت کا پوری جوانمردی سے مقابلہ کیا۔ یہ سلسلہ جاری رہا تاآنکہ پنڈت جواہرلال نہرو نے ۱۹۵۳ء میں ذاتی مداخلت کرکے

جھوٹی کارروائیوں کو ختم کروایا اور ایک شریف خاندان کو اپنا ممنون احسان کیا۔
لائق علی کابینہ کے خلاف مقدمہ میں آپ کو شریک کیا گیا اور مکان پہ آپ کو نظر بند کیا گیا۔ جب لائق علی صاحب فرار ہو گئے تو والد صاحب کو مکان سے سنٹرل جیل چنچل گوڑہ منتقل کیا گیا۔ اس وقت ہم سب عزیز احمد صاحب مرحوم انجینئر کی شادی میں شرکت کے لئے کاچی گوڑہ گئے ہوئے تھے جو میرے پھوپھا محمد ولی اللہ صاحب کی دختر سے قرار پائی تھی۔ گھر میں صرف والد صاحب اور والدہ صاحبہ تھیں۔ جب ہم واپس ہوئے تو اس وقت تک والد صاحب کو مکان سے منتقل کر دیا گیا تھا اور ہمیں صرف ان کی ایک تحریر ملی جو میرے چچا مولوی رکن الدین احمد صاحب کی موسومہ تھی۔ ایسے ہی موقع پر انسان کے اصلی کردار ظاہر ہوتے ہیں چونکہ اس تحریر سے ان کے کردار پر روشنی پڑتی ہے اس لئے اس کا اقتباس پیش ہے۔

"حکومت کے حکم سے میں اس وقت (ساڑھے ۷) بجے شام صدر محبس بلدہ منتقل کیا جا رہا ہوں۔ فی امان اللہ، خداوند کریم پر بھروسہ ہے اور تم سب بھی اس پر بھروسہ رکھو اس کا فضل شامل حال رہے تو بس نہ ہے ہمت اور استقلال سے رہو احمد حسن اور زہرہ سے مجھے یہی توقع ہے۔ میں نہایت مستقل مزاجی سے جا رہا ہوں"

اسی طرح ایک معروضہ سرکار کی خدمت میں بھی لکھا۔ والد صاحب گذشتہ چالیس سال سے نہایت پابندی سے روزنامچہ لکھا کرتے تھے۔ جو قدیم حیدرآباد کے سماجی معاشرتی اور سیاسی حالات پر ایک قیمتی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔
۸ر جولائی کی شام کو ۶ بجے جب کہ وہ اپنے قدیم روزنامچے کو دیکھ رہے تھے

تو اُن پر قلب کا حملہ ہوا ۔ ۵ بجے تک وہ اپنے دفتر پیشی کے ساتھ کام میں مصروف رہے اور آخر وقت تک ان کے ماتھے پر مشقت کا پسینہ سوکھنے نہ پایا جو ارشاد نبویؐ کے بموجب ایک مردِ مومن کی علامت ہے ۔

وصیت نامہ عام طور پر خانگی حیثیت رکھتا ہے ۔ لیکن والد صاحب کی زندگی ان کا وقت اور ان کی صلاحیتیں عوام کے لئے وقف تھیں اور ان کے وصیت نامہ میں ایک سے زائد باتیں ایسی ہیں جن سے اہل ملک استفادہ کر سکتے ہیں اس لئے اس کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے ۔

" الحمد للہ میری زندگی اچھی گزری ۔ مصائب کے دور سے بھی گزرنا پڑا ۔ میں خود کو خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ ملک و مالک کی خدمت اور بنی نوع انسان کی خدمت میرا نصب العین رہا ۔ صداقت اور بے لوثی کے ساتھ میں نے ہمیشہ اپنے مفوضہ خدمات انجام دیئے ۔ خلق اللہ کی خدمت اور صداقت کو میں بڑی عبادت اور اپنے مالک سے وفاداری کو اپنے لئے وسیلہ نجات سمجھتا ہوں ۔

میں ایک بے مایہ بے سرمایہ شخص ہوں ۔ میرے فرزند دوم ... عزیز الدین احمد جس کی مستقل ملازمت اور اس کے گھر دار کی مجھے فکر لگی رہتی ہے ۔ مجھے افسوس ہے کہ اس کے لئے میں کوئی خاطر خواہ سرمایہ مہیا نہ کر سکا ۔ الحمد للہ میں کسی کا قرض دار نہیں ہوں ۔ میری تجہیز و تکفین وغیرہ کے مصارف کیلئے ایک لفافہ رکھ دیا ہے اپنے پسماندگان کو خدا کے حوالے کرتا ہوں اور بس ۔

پروردۂ سرحدِ تلنگانہ

۲۸ ستمبر ۱۹۷۳ء کو اردو کے ایک کہنہ مشق رباعی گو شاعر نے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کی۔

راگھویندر راؤ جذب ۲۰ اپریل ۱۹۰۴ء کو گنگاوتی (کرناٹک) میں پیدا ہوئے۔ دو سال کی عمر میں عالم پور (حال آندھرا پردیش) بطور متبنیٰ آئے یہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی منشی فاضل اور ادیب فاضل کے نصاب کی تکمیل کی اس کے بعد امتحان جوڈیشل کامیاب کیا۔ دس بارہ سال تک پیشہ وکالت انجام دیتے رہے۔

جب طبیعت میں شاعری کا مادہ ہوتا ہے تو اس کا اظہار ہو ہی جاتا ہے۔ چنانچہ پندرہ سولہ سال کی عمر سے شعر کہنے لگے۔ آپ نے حضرت شوکت میرٹھی اور ترکی سے اصلاح لی۔ حضرت سحاؔ دہلوی سے علم عروض و زبان سیکھی۔ کچھ دن حضرت امجدؔ سے بھی مشورہ سخن کرتے رہے اس کا ذکر میں نے آہنگ "جذب" کے پیش لفظ میں یوں کیا ہے۔

"آج سے تقریباً چالیس سال قبل اردو رباعیات کے بادشاہ سید احمد حسین

امجد کے پاس ایک ۳۶ سالہ برہمن نژاد وکیل کی لکھی ہوئی رباعیات کا مجموعہ بذریعہ ڈاک وصول ہوا تو انھوں نے فوری دو سطری رائے لکھ کر کتاب واپس کر دی اور جب شخصی ملاقات ہوئی جو آناً فاناً دوستی میں تبدیل ہو گئی تو تقریظ میں یہ لکھا "مجھے تو نگاہ محبت تمام رباعیاں اچھی ہی معلوم ہوتی ہیں ممکن ہے کہ کسی کو میری رائے سے اختلاف ہو" اور انتقال سے دو سال قبل یہ رباعی لکھی ۔

انسان کی ترقی کے لئے زینہ ہے
اخلاقِ حکیمانہ کا گنجینہ ہے
سچ تو یہ ہے کہ جذب صاحب کا کلام
جذباتِ دلی یا صاف آئینہ ہے

اگر امجد کلام دوست کو بہ نظر دشمن دیکھتے جیسا کہ غالب کا وطیرہ تھا اور جیسا تذکرہ انھوں نے حبیب اللہ ذکا کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کے نام ایک خط میں کیا ہے تو بھی یقین ہے کہ ان کی تمام رباعیاں اچھی ہی معلوم ہوتیں۔"

جذب کا کلام اردو شاعری کی تقریباً ہر صنف میں موجود ہے لیکن ان کو صنف رباعی سے فطری اُنس تھا۔ جذب اردو کے ان چند شاعروں میں تھے جنھوں نے رباعی کی طرف خصوصی توجہ کی ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ امجد کے علاوہ یہ ان گنتی کے شاعروں میں سے ہیں جنھوں نے اس صنف سخن کو خصوصی طور سے اپنایا تو شاید یہ غلط نہ ہو گا ۔

جذب کو رباعی کے فن پر غیر معمولی قدرت حاصل رہی تو اس کی اصل وجہ یہ

تھی کہ انھوں نے اپنی ساری زندگی اس فن میں پاپڑ بیلے، جب جان کھپائی تو یہ مقام حاصل کیا۔ چنانچہ پروفیسر احتشام حسین فرماتے ہیں ۔

"آپ نے سالہاسال کی ریاض سے رباعی نگاری میں جو پختگی حاصل کی ہے وہ کم لوگوں کے حصے میں آئی ہے ۔ عمر نے اظہار بیان ہی میں نہیں خیالات میں گہرائی اور بلندی پیدا کر دی ہے ۔"

پنڈت امرناتھ مدن ساحر دہلوی فرماتے ہیں ۔

"خیالات کی رفعت کے ساتھ ساتھ سلاست کو بھی مدنظر رکھا گیا ہے"

آپ کی رباعیات کے کئی مجموعہ شائع ہو کر مقبول خاص و عام ہو چکے ہیں ۔

مجھے ڈاکٹر زور کے توسط سے جذب سے غائبانہ تعارف تھا اور ایک عرصہ سے موصوف سے عقیدت تھی ۔ ۱۹۷۰ء میں جب کہ میری تعیناتی محبوب نگر پر تھی تو میرے دیرینہ دوست نواب مظفر الدین خاں صاحب نے جو خود بھی ایک اچھے رباعی گو شاعر ہیں مجھے توجہ دلائی کہ جناب جذب کے غیر مطبوعہ رباعیات کا کافی ذخیرہ ہے ۔ ان کی اشاعت کسی طرح ہونی چاہیئے موصوف کو جذب سے دلی عقیدت تھی اس کا بڑا اچھا اظہار انھوں نے فرمایا ہے ۔

گزرے ہوئے ادوار کے شاہد ہیں جذب
آزاد منش صوفی و زاہد ہیں جذب!
اب ملک دکن میں نہیں ان کا ثانی!
میدان رباعی کے مجاہد ہیں جذب

چنانچہ میں نے ویلفیر فنڈ کمیٹی محبوب نگر سے رقمی منظوری دی اور دسمبر ۱۹۷۰ء

میں جذبؔ کے رباعیات کا مجموعہ "آہنگ جذبؔ" کے نام سے محبوب نگر سے شائع ہوا۔ اس طرح مجھ کو جذبؔ کے غیر مطبوعہ کلام کو شائع کرنے کی سعادت حاصل ہوتی اس کتاب پر جذبؔ کو حکومت ہند کی جانب سے ایک ہزار روپے کا ایوارڈ بھی ملا جو انھوں نے دہلی جاکر حاصل کیا۔ جب اس دور ان ان سے کئی ملاقاتیں ہوئیں تو ان کا احترام میرے دل میں پیدا ہوا ان کی طبیعت میں شرافت اور انکساری کوٹ کوٹ کر بھری تھی ۔

اسی انکساری کا نتیجہ تھا کہ جذبؔ نے ابتدا ہی میں ایک غلطی یہ کی کہ اپنی دانست میں یہ تصور کر لیا کہ وہ شاعر نہیں ہیں اور محض بطور مشغلہ رباعیات لکھتے ہیں کہ اس صنف سے ان کو انسیت ہے ممکن ہے کہ یہ احساس کمتری ماحول کو ناسازگار ہونے کی بنا پر ہو یا پھر اس بنا پر کہ ان کے کلام میں صداقت کی سادگی ہے اور وہ اجزا نہیں ہیں جو اردو شاعری کی زینت ہوتے ہیں حالانکہ ان اجزا کے نہ ہونے پر بھی ان کی شاعری معیاری شاعری ہے ۔ فرماتے ہیں ۔

کہتا ہوں کبھی کہ مجھ کو دولت دیدے
سائل ہوں کبھی کہ علم و حکمت دیدے
سب آرزوئیں مٹا کے اب کہتا ہوں
یارب مجھے اپنی ہی محبت دیدے

جس کا بزم خلوص میں نام آئے
رشک اہلِ وفا کو سحر و شام آئے

جو کام میں اپنے رہے انساں وہ نہیں
انسان وہ ہے جو دوسروں کے کام آئے

دنیا کی فضاؤں میں جو تنویریں ہیں
یہ سب شمع فنا کی تفسیریں ہیں

انسان کو تو نے کیا سمجھ رکھا ہے
کچھ بھی نہیں چلتی پھرتی تصویریں ہیں

آپ کے اشعار اس قابل نہیں کہ ارباب نشاط کے کوٹھوں پہ بار پائیں بلکہ اہل علم کی بارگاہ میں آئیں اور صلہ آفریں پائیں۔ یہ رنگ ان کو ایسی انفرادیت بخشتا ہے جس کے وہ تنہا مالک ہیں۔ اسی طرح زبان کے تعلق سے ایک جگہ لکھتے ہیں

"جنوبی ہند کا ایک برہمن ہونے کے سبب زبان کی شگفتگی اور فن کی خوبی سے مجھے کوئی سروکار نہیں اور نہ اس کا اندیشہ ہے۔ زبان و فن کی خامیوں کا ہونا ہی میرے لئے باعث فخر ہے۔ میں محض اپنے شوق کی تکمیل میں جو کچھ کہتا ہوں اس کو پبلک میں پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں۔ یہ ایک جنون ہے اور بس"

ہاں یہ ایک ایسا جنون ہے جس پر عقل و دانش ہوش و خرد کو نثار کیا جاسکتا ہے شاید جذب نے اپنا لوہا منوانے کے لئے یہ انوکھا انداز اختیار کیا ہو۔

میں نے اوپر کہا ہے کہ جذب کا یہ احساس کمتری شاید ماحول کے ناسازگار ہونے کی بنا پر ہوا اس لئے ماحول کے ناسازگار ہونے کی وضاحت ضروری ہے دکن کو ہمیشہ اس بات کا احساس رہا کہ اردو پر دلی اور لکھنؤ اپنا حق جتلاتے رہے حالانکہ اردو کی زلفوں کو سنوارنے میں

دکن بھی کسی اور خطہ ہند سے پیچھے نہیں رہا۔ دلّی کی جامع مسجد کی سیڑھیوں کے پاس بولی جانے والی زبان کو معیاری قرار دینے کے بعد یقیناً اہل دلی یا قریب قریب ویسی ہی بولی بولنے والے اہلِ لکھنؤ کے لئے ادب میں مقام حاصل کرنا مشکل نہ تھا۔ کم ازکم ان کے فن پر زبان کی غلطیاں نکالنے کا امکان تو نہ تھا اہل دکن کے لئے معیاری زبان میں مقام حاصل کرنا کوئی آسان کام نہ تھا جن دکن والوں کی مادری زبان اردو تھی جب ان کے لئے یہ مشکل درپیش تھی تو ان ادیبوں کے مسائل کا اندازہ لگانا مشکل نہیں جن کی مادری زبان اردو نہ تھی ان کو دو سرحدوں کو عبور کرنا تھا۔

پروردۂ سرحد تلنگانہ راگھویندر راؤ جذبؔ عالم پوری جن کی مادری زبان کنڑی تھی ان شاعروں میں سے تھے جنھوں نے ان دونوں سرحدوں کو پار کیا۔ انھوں نے جو مقام حاصل کیا اس کا اندازہ ان کے کلام کو دیکھ کر کیا جاسکتا ہے بقول پروفیسر نورالحسن ہاشمی۔

"ہر رباعی کلاسیکی ادب کی شان رکھتی ہے کیوں کہ اس میں رچا ہوا انداز بیاں بھی ہے اور صاف ستھری شگفتہ زبان بھی یکسر اردو معلیٰ کا نمونہ ہے"

لیکن ان دو سرحدوں کو پار کرنے کے بعد بھی جذبؔ آسان راہوں پر چلنے والے نہ تھے انھوں نے رباعی پر توجہ دی جس کے وزن سے لوگ گھبراتے ہیں اور بقول ڈاکٹر فرمان فتح پوری جس کے وزن سے غالبؔ جیسا شخص بھی دھوکا کھاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ رباعی بڑی مشکل صنف ہے۔ جذبؔ نے اس صنف سخن میں فن اور ہیئت کی نگہداشت کے ساتھ ساتھ ادبی معیاروں کو بھی برقرار رکھا ہے۔ جذبؔ نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ عشق مجازی کے ذکر کی بجائے جو زیادہ دل چسپی کا باعث ہوتا سیدھی سادی نصیحت آمیز باتوں کو رباعیات کا موضوع قرار دیا۔ اور اپنی رباعیات میں اخلاقی پند و نصائح بیان کرتے رہے جس کو انسانیت سے بے پناہ محبت کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے ؎

خوشی جس نے کھوجی وہ دھن لے کے لوٹا
ہنسی جس نے کھوجی چمن لے کے لوٹا
مگر پیار کو کھو جنے جو چلا وہ
نہ تن لے کے لوٹا نہ من لے کے لوٹا

زاہد از پچاس سال کی تپسیا اور اسی سال کی "عمر نوردی" کے بعد تن اور من کی بھینٹ چڑھا کر جذبؔ نے جو چیز حاصل کی وہ ان کی شاعری میں آپ کو ملے گی۔ ان کی شاعری اس قابل ہے کہ اردو کو اس پر ناز ہو۔ جذبؔ کی رباعیات اعلیٰ قدروں کی حامل ہیں۔ بقول حضرت امجدؔ۔

"ہندی اور سنسکرت کو اردو جامہ پہنانے میں ایک حد تک کامیاب ہوتے ہیں"

اور بقول ماہر القادری۔

"اردو سے انس ہونے کے سبب ہندی سنسکرت تلنگی وغیرہ

میں جو نادر چیزیں دیکھنے میں آئیں ان کو اردو کا جامہ پہنا کر اہل اردو کے روبرو پیش کیا ۔"

انھوں نے سنسکرت کے مشہور شاعر بھرتری ہری کے خیالات کی ترجمانی میں رباعیاں کہی ہیں اور اس طرح اردو کی ایک انوکھی خدمت کی ہے بقول خواجہ احمد فاروقی ۔

"کلام استادانہ ہے اور اس لائق ہے کہ اسے لب ادب سے بوسہ دیا جائے ۔"

جذب کی غزلیات کے مجموعہ کی اشاعت کی سعادت بھی مجھے حاصل رہی جو "سازِ غزل" کے نام سے ولا اکیڈیمی سے شائع ہوا ۔ اس کی اشاعت میں سابق چیف منسٹر مسٹر پی ۔ وی ۔ نرسمہا راؤ نے بھی خاصی دلچسپی لی جن کو جذب سے خاص عقیدت تھی ۔

جذب نے جنوبی ہند کے پانچ سو شعراء کا ایک تذکرہ بھی لکھا ہے جس کی اشاعت کی نوبت نہیں آئی ۔ اسی طرح آپ نے سنسکرت تلنگی کنڑی کی کئی صدہا سال کی پرانی کتابوں کے منظوم ترجمے کئے ۔ ان کی اشاعت اردو ادب میں ایک بیش بہا اضافہ ہوگا ۔

جذب کو مرکزی ریاستی حکومت سے ادبی وظیفہ بھی جاری رہا ۔ ضرورت ہے کہ اردو داں ان کے کلام کی قدر کریں اور جذب کو اس شکایت کا موقع نہ دیں کہ ان کا سخن نظر ناشناس ۔ جس کو وہ سب سے بڑی نحوست قرار دیتے ہیں ۔

مرے نتیجۂ اعمال پر بطورِ سزا
جبیں پہ لکھ دے الٰہی نحوستیں ساری
سخن کو اپنے مگر نذرِ ناشناس کروں
نہ لکھ براہِ کرم یہ نہ لکھ ہے عرض آنی

پیکرِ اخلاص

چند سال قبل ڈاکٹر یوسف الدین صاحب پروفیسر مذہب و ثقافت جامعہ عثمانیہ دمشق گئے تھے تو وہاں کے ناظر تعلیمات پروفیسر صلاح الدین المنجد نے وہاں کے مشہور و معروف کتب خانہ ظاہریہ کا معائنہ کروایا اور کہنے لگے "جب ہندوستان کے مسلمان ہمارے ملک کو آتے ہیں تو صرف یہاں کی قبروں کی زیارت کو جاتے ہیں ہم سے اور ہماری کتابوں سے نہیں ملتے۔ دیکھئے اس کتب خانہ میں دس ہزار نایاب کتابیں ہیں"۔ ڈاکٹر یوسف الدین نے کہا "میں صرف دس روز ٹھہر رہا ہوں اس لئے روزانہ ایک ہزار کتابیں دیکھنا ممکن نہیں ہے آپ مجھے صرف نایاب کتابیں دکھلایئے"۔ جناب صلاح الدین المنجد نے فوراً ابن عساکر کی تاریخ دمشق منگوائی اور فرمایا "یہ ہمارے کتب خانہ کی قدیم ترین کتاب ہے لیکن یہ نامکمل ہے میں نہیں جانتا کہ اس کے باقی اجزاء کہاں ہیں"۔ ڈاکٹر یوسف الدین نے اس کتاب کو دیکھ کر فوراً جواب دیا "حیدرآباد کے کتب خانہ سعیدیہ میں اس نایاب کتاب کے باقی اجزاء موجود ہیں"۔ اور واقعہ یہ ہے کہ کتب خانہ سعیدیہ کا شمار دنیا کے ان چند خاص کتب خانوں میں ہے جس کی

کتابیں بہت نایاب اور کمیاب ہیں۔

ڈاکٹر یوسف الدین صاحب ڈرامائی انداز میں یہ انکشاف اس وجہ سے کر سکے کہ کتب خانہ سعیدیہ اُن کا خاندانی کتب خانہ ہے اور انھوں نے آنکھیں کھولتے ہی اس علمی ذخیرہ کو دیکھا اور اس سے استفادہ کیا۔

یہ کتب خانہ خاص اہمیت کا حامل ہے افسوس ہے کہ اہلِ ملک اس کی اہمیت سے ویسے واقف نہیں ہیں جیسے اس کا حق ہے۔ افراد کے لئے خاموش خدمت ایک مستحسن بات ہے لیکن اداروں کے لئے یہی بات نامناسب ہے۔ اہلِ دکن یوں بھی فطرتاً منکسر المزاج واقع ہوتے ہیں۔ کتب خانہ سعیدیہ جس خاندان کی ملک ہے ان کا انکسار تو حد سے زیادہ ہے جو افراد سے آگے بڑھ کر اداروں کو بھی اپنے احاطہ میں لئے ہوئے ہے۔ پھر اہلِ ملک کا تغافل اور بے رخی اس پر مستزاد نتیجہ ظاہر ہے کہ یہ کتب خانہ جو بلحاظ اہمیت خدا بخش لائبریری پٹنہ سے کسی طرح کم نہیں وہ شہرت حاصل نہ کر سکا جو خدا بخش لائبریری یا رام پور کے شاہی کتب خانوں کو حاصل ہے۔

اِس کتب خانہ کے بانی مفتی محمد سعید صاحب کا تعلق جنوبی ہند کے مشہور علمی خاندان اہلِ نائطہ سے ہے۔ آپ قاضی بدر الدولہ کے بڑے فرزند اور محمد غوث شرف الملک کے پوتے تھے۔ آپ کی ولادت ۳ رجادی الاول ۱۲۴۷ ہجری (۱۸۳۱ء) کو بمقام مدراس ہوئی۔ ... سر سالار جنگ اوّل نے آپ کے فضائلِ علوم کے لحاظ سے آپ کو حیدر آباد طلب فرمایا۔ ۱۸۷۱ء میں آپ کا تقرر بحیثیت رکن اول مجلس مرافعہ عمل میں آیا۔ عرصہ تک آپ عدالت

دیوانی بزرگ کے ناظم بھی رہے پھر مفتی عدالت العالیہ کے عہدہ پر فائز رہے جامعہ نظامیہ اور دائرۃ المعارف کے قیام میں نواب عماد الملک کے ساتھ تعاون فرمایا اور اس کی مجلس انتظامی اور علمی کمیٹی میں بحیثیت رکن شریک رہے۔ آپ کا انتقال ۱۰ رشعبان ۱۳۱۲ ہجری م۔ ۶ ر فروری ۱۸۹۵ء بمقام حیدرآباد ہوا (تاریخ النوائط میں ۱۳۱۴ھ درج ہوا ہے جو غلطی معلوم ہوتی ہے۔) سرکاری جریدہ اعلامیہ مورخہ ۲۴ رشعبان ۱۳۱۲ ہجری میں اس حقیقت کا اظہار کیا گیا کہ۔ مولوی صاحب ایک نہایت متدین اور بڑے فقیہہ تھے۔ عہدہ افتاء مجلس کو ان کی ذات سے اعزاز تھا۔ اور ان کے انتقال سے مجلس میں ایک بڑا فقیہہ اور فاضل کم ہو گیا"

کتب خانہ سعیدیہ مفتی صاحب کے خاندانی ذخیرہ کتب اور خود اُن کی فراہم کی ہوئی نادر کتابوں پر مشتمل ہے۔ کتب خانہ سعیدیہ مخطوطات کا ایک انمول ذخیرہ ہے جو پشتہا پشت سے محمد سعید صاحب کے خاندان میں چلا آتا ہے۔ ونیز مفتی صاحب نے مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، بغداد، دمشق، قاہرہ وغیرہ کے علمی کتب خانوں سے نایاب علمی کتب کی نقلیں سو سال قبل کروائیں اور اپنے ذخیرہ کو اہمیت کا حامل بنایا نواب عزیز جنگ ولا اپنی شہرہ آفاق کتاب... تاریخ النوائط میں فرماتے ہیں کہ آپ کی آمدنی کی چوتھائی ہمیشہ کتب خانہ کی تکمیل میں صرف ہوا کرتی تھی بلاد مصر و روم شام، مکہ معظمہ مدینہ مطہرہ اور ہندوستان کے مشہور شہروں میں آپ کے کاتب مقرر تھے نایاب کتابوں کی بہت سی جلدیں نقل کے ذریعہ سے آپ کے کتب خانے میں پہنچ جاتی تھیں۔ (تاریخ النوائط ص ۵۴)

اس کتب خانہ کو مفتی محمد سعید صاحب نے اپنی زندگی کا جزو بنالیا تھا اور مفتی صاحب کی زندگی کا بیان اس کتب خانہ کی تفصیلات کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا اس لئے اس موقع پر کتب خانہ سعیدیہ کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔

ستمبر ۱۹۳۴ء میں کتب خانہ سعیدیہ قومی اثاثہ بن کر تمام علمی دنیا کے استفادہ کے لئے عام ہوگیا اور اس کی موجودہ عمارت واقع جام باغ روڈ میں اس کتب خانہ کا افتتاح نواب سر نظامت جنگ کے ہاتھوں عمل میں آیا۔

موجودہ عمارت مفتی صاحب کے بھانجے الحاج حافظ مولوی محمد عبدالعظیم کی زرخرید ہے۔ موصوف زندگی بھر کتب خانہ کے کاروبار اور انتظام میں سرگرمی سے حصہ لیتے رہے اور خود کو اس کتب خانہ کے لئے گویا وقف کردیا ــــــــ

راقم الحروف کو مولوی عبدالعظیم صاحب سے نیاز حاصل رہا ہے ــــــــ ایسے پُرخلوص کام کرنے والے کم نظر آتے ہیں ــــــ جب اس کتب خانہ سے گلستانِ سعدی کا قیمتی اور نایاب نسخہ چوری ہوا تو آپ ہی کی جستجو اور کوشش سے اس کی بازیابی عمل میں آئی ــــــــ حافظ صاحب کے انتقال کے بعد ان کے بھائی مولوی برہان الدین نے کتب خانہ کی ذمہ داری کو سنبھالا۔ ان کے بعد ڈاکٹر محمد غوث نے معتمدی کے فرائض انجام دیئے اور اب الحاج مولوی عبدالغنی بحیثیت معتمد اعزازی فرائض انجام دے رہے ہیں ان تمام اصحاب نے جس خلوص۔ انہماک جانفشانی اور انکساری کے ساتھ بے لوث خدمات انجام دیں وہ اسی خاندان کا حصہ ہے ....

....

کتب خانہ سعیدیہ کا ذخیرہ کتب چار اقسام پر مشتمل ہے ۔

(۱) اہل خاندان کی تصانیف جو انھوں نے عربی۔ فارسی اور اردو میں فنون تفسیر حدیث۔ فقہ۔ سیرت۔ عقائد۔ تاریخ اخلاق۔ فلسفہ اسلام۔ ہیئت۔ قرآن۔ توراۃ۔ انجیل وغیرہ پر لکھی ہیں۔ ان کی تعداد ایک ہزار سے زائد ہے۔ ان میں سے بعض طبع ہو چکی ہیں اور اکثر ابھی غیر مطبوعہ ہیں۔ خود مفتی محمد سعید کی تصنیفات مختلف فنون میں ۱۸ سے زائد ہیں ۔

(۲) اہل خاندان کے ہاتھ سے نقل کی ہوئی یا کروائی ہوئی کتابیں۔ قدیم سے علماء کا طریقہ یہ تھا کہ جو کتابیں ان کو حاصل ہو جاتیں اُن کو نقل کر لیتے۔ خصوصاً یہ کام دور دراز کے سفر یا حج وغیرہ ہر موقع پر ممکن ہوتا چنانچہ تفسیر۔ تجوید۔ سیرت۔ فقہ۔ کلام ہیئت۔ منطق۔ تاریخ وغیرہ پر ہزاروں قلمی کتابیں موجود ہیں۔ ان کی بڑی تعداد غیر مطبوعہ ہے ۔

(۳) متقدمین کی خود ان کے ہاتھ سے لکھی ہوئی کتابیں۔ نواب شرف الملک بہادر قاضی بدر الدولہ اور پھر مفتی محمد سعید خاں نے متقدمین کی لکھی ہوئی نایاب قلمی کتابیں خریدیں اگر وہ ناقص تھیں تو ان کو خود تحریر کر کے مکمل کیا چند کتابیں بارہویں صدی عیسوی کی اور متعدد تیرہویں اور چودہویں صدی عیسوی کی لکھی ہوئی . . . موجود ہیں ۔

(۴) قلمی اور مطبوعہ عام کتب ۔

حکومت ہند کے مجوزہ نمونہ پر انگریزی میں ایک کیٹلاگ شائع ہو چکا ہے۔ یہ کتب خانہ کے مخطوطات کی جلد اول ہے۔ اس کیٹلاگ کی رسم اجرائی

جناب فخرالدین علی احمد صاحب مرکزی وزیر حکومت ہند کے ہاتھوں جنوری ۱۹۷۰ء
میں انجام پائی۔ اس کتب خانہ میں قلمی کتابیں پانچ ہزار سے زائد ہیں۔ مطبوعہ
کتابوں کی تعداد بھی بہت ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے ۲۷ر ستمبر ۱۹۵۲ء کو اس کتب خانہ کا تفصیلی معائنہ
فرمایا اور اپنے تاثرات یوں ظاہر کیے "یہ ذخیرہ اتنا عظیم الشان ہے کہ اس کی حفاظت
بہت ضروری ہے۔ اس کی حفاظت نہ صرف خاندان کے افراد بلکہ خود حکومت
کا فرض ہے۔ اس کی حفاظت کے لئے میں ہر طرح مدد کرنے کو تیار ہوں جو کرنا ہے
جلد کر لینا چاہئے۔ کیوں کہ زمانہ کے حالات بہت بدل رہے ہیں"۔

اسی طرح ڈاکٹر ذاکر حسین صدر جمہوریہ ہند نے ۱۸ر مئی ۱۹۶۳ء کو اس کتب
خانہ کا معائنہ فرما کر یوں رائے ظاہر فرمائی۔

"پرانی قلمی کتابوں کا نہایت ہی گرانقدر مجموعہ یہاں ہے حدیث تفسیر اور رجال
میں خصوصیت سے بڑے بے بہا نوادر یہاں محفوظ ہیں۔ خطاطی اور جلد سازی کے
بھی بہت اچھے نمونے ہیں۔ گلستان کا ایک نایاب نسخہ خط جلد۔ آرائش ہر اعتبار
سے بے مثل کہا جا سکتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اسلامی علوم کی قلمی کتابوں کے اعتبار
سے یہ کتب خانہ ہندوستان کے بہترین ذخیروں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ جس
خاندان نے اس کو ایک عالم کے لئے کارآمد بنانے کا ذمہ لے رکھا ہے وہ قومی شکریہ
کا مستحق ہے" اور اس خاندان کے قابل فخر سپوت منشی محمد سعید صاحب بھی یقیناً
قومی شکریہ کے مستحق ہیں اور ان کی علمی خدمات کا اعتراف ہر ہندوستانی کا مقدس
فرض ہے۔

ایک عالمِ دین

یہ ایک عالم دین کی داستان ہے جس نے خاموشی کے ساتھ دین کی خدمت کی اور جو علمی اور تحقیقی صلاحیتیں اس کو ودیعت کی گئی تھیں ان کو تبلیغی کاموں پر صرف کیا اور جب ۷ ار ستمبر ۱۹۷۰ء کو وہ اس دنیا سے رخصت ہوا تو اپنے پیچھے قابل قدر علمی کارنامے چھوڑ گیا۔

علی موسیٰ رضا مہاجر کا تعلق جنوبی ہند کے اس معزز اور علمی خاندان سے تھا جو اہل نائط کے نام سے مشہور ہے اور جس نے قاضی بدرالدولہ شمس العلماء نواب عزیز جنگ ولا اور ڈاکٹر حمید اللہ جیسے نامور عالم پیدا کئے۔

آپ کے دادا علی موسیٰ رضا مہاجر کے متعلق عزیز جنگ ولا اپنی شہرہ آفاق کتاب تاریخ النوائط میں فرماتے ہیں۔

"دربار والا جاہی سے آپ کو احتشام خاں رفعت جنگ بہادر کا خطاب اور بخشی فوج کی پیش کاری کا عہدہ عطا ہوا تھا۔ آپ نہایت ذی علم اور صاحب تقویٰ قبیلہ پرور امیر تھے۔ والی ریاست کرناٹک ... آپ کو بلحاظ اعزاز خاندانی عزیز رکھتے تھے۔ آپ نہایت قابل

شخص ہیں علوم دینی کے علاوہ علوم مغربی کے بھی ماہر ہیں مؤلف تاریخ کو
آپ کی ملاقات کا اعزاز حاصل ہے ؛

آپ کے والد غضنفر حسین مہاجر کو حکومت مدراس کی جانب سے فارسی دستاویزات اور سرکاری کاغذات کا انگریزی ترجمہ کرنے کے لئے مقرر کیا گیا تھا وہ آخر عمر تک مدراس ہی میں رہے اور ۱۹۳۰ء میں وہیں وفات پائی۔

علی موسیٰ رضا مہاجر کی پیدائش ۱۸۹۷ء میں مدراس میں ہوئی ان کی ابتدائی تعلیم مدراس ہی میں ہوئی۔ ۱۹۱۵ء میں وہ حیدرآباد تشریف لائے۔ ۱۹۱۷ء میں نظام کالج سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان کامیاب کرنے کے بعد بہ حیثیت مدرس محکمہ تعلیمات میں ملازمت اختیار کی جب جامعہ عثمانیہ میں بی۔ اے کے امتحانات کا انتظام ہوا تو ۱۹۲۳ء میں آپ نے خانگی امیدوار کی حیثیت سے شرکت کی اور درجہ دوم میں کامیابی حاصل کی۔ اسی سال آپ کی شادی ہوئی۔ آپ کو محکمہ کوتوالی میں ملازمت کی پیشکش ہوئی تھی مگر آپ نے محکمہ تعلیمات میں ملازمت کو ترجیح دی۔

۱۹۱۹ء میں آپ نے مدرسہ فوقانیہ چادرگھاٹ میں اسکاؤٹ ٹروپ کی تنظیم کی اور پہلی اسکاؤٹ ریلی منعقد کی۔ جس کی صدارت سرسید احمد خاں کے نبیرہ ڈاکٹر راس مسعود نے فرمائی۔ جو اس وقت ریاست حیدرآباد کے ناظم تعلیمات تھے۔ سر راس مسعود کو یہ ریلی اس قدر پسند آئی کہ انھوں نے تمام سرکاری مدرسوں میں اسکاؤٹ تحریک شروع کرنے کی تجویز پیش کی۔ چنانچہ جناب ایس ایم ہادی کے زیر نگرانی جو اس وقت ناظم ورزش جسمانی تھے اسکاؤٹ آرگنائزیشن قائم کیا گیا۔ علی موسیٰ رضا مہاجر اس تنظیم کے ڈپٹی آرگنائزنگ کمشنر مقرر کئے گئے ـــــ

موصوف نے بیس سال تک اس حیثیت سے کام کیا اور اسکاوٹ تحریک کی ترقی کے لئے نمایاں کام انجام دیئے۔ آپ ہی کے زمانہ میں اسکاوٹ کی ذیلی تحریکات "روور" اور "کب" وجود میں آئیں آپ نے کم و بیش چار ہزار اسکاوٹوں کو تربیت دی جن میں اسکاوٹ ماسٹر کب ماسٹر اور روور لیڈر شامل تھے۔

اردو زبان میں اسکاوٹنگ پر آپ نے کافی لٹریچر فراہم کیا ہے اور اس حیثیت سے آپ کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ آپ نے اسکاوٹنگ تحریک پر اردو زبان میں ایک رسالہ الکشافہ جاری فرمایا اور آپ کی کتاب مبادیات کشافہ کافی مقبول ہوئی جس کو اردو زبان میں اس تحریک پر پہلی کتاب کا درجہ حاصل ہے۔

آپ نے اسکاوٹ کے اجتماعوں کی تنظیم کی اور اسکاوٹ کی نمائش منعقد کی۔ آپ نے اس تحریک سے متعلق جو چارٹ مرتب کئے وہ آج تک اسکاوٹ ہیڈ کوارٹرز کی زینت ہیں۔

ان ہی نمایاں خدمات اور تحریک سے مسلسل وابستگی کی بنا پر اسکاوٹنگ میں آپ کو ایک فنی ماہر کی حیثیت حاصل ہوگئی اور حیدرآباد میں آپ کو "بابائے اسکاوٹنگ" کا لقب دیا گیا۔

دارالعلوم کی گولڈن جوبلی کے وقت ثقافت اسلامی کی نمائش کا انعقاد ہوا تو علی موسیٰ رضا مہاجر کے بنائے ہوئے چارٹس اور نقشوں کو جو گھڑی کی ایجاد سے قبل کی دھوپ گھڑی سے متعلق تھے خصوصی قرار دیا جا کر گولڈ میڈل کا مستحق قرار دیا گیا۔

آپ کو شکار سے بھی دلچسپی رہی اور آپ نشانہ بازی کے ماہر شمار کئے جاتے تھے۔

۱۹۵۲ء میں ۳۳ سال کی طویل اور لائق ستائش ملازمت کے بعد مدرسہ فوقانیہ نرمل کے صدر مدرس کی حیثیت سے آپ وظیفہ حسن خدمت پر علیحدہ ہوئے۔

اپنی ملازمت کے دوران آپ نے ہمیشہ طالب علموں اور کھلاڑیوں کی ہمت افزائی فرمائی اور جب کبھی کسی طالب علم میں صلاحیت دیکھی اس کی ممکنہ حوصلہ افزائی فرماتے تھے۔ مشہور پیراک ایس یم جیلانی آپ کے شاگرد رہے ہیں۔ موصوف نے جب ۱۹۴۷ء میں حسین ساگر میں ۲۴ گھنٹے پیراکی کا تاریخی مظاہرہ کیا تو اس کی سرپرستی علی موسیٰ رضا مہاجر نے فرمائی آج جبکہ آپ کا یہ عزیز شاگرد آندھرا پردیش میں بابائے پیراکی کہلانے کا مستحق ہے اور جس نے بہ حیثیت وائس پریزیڈنٹ سوئمنگ فیڈریشن آف انڈیا دنیائے پیراکی میں اونچا مقام حاصل کیا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس شاگرد کی تمام کامیابیوں کا سہرا آپ کے سر ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ ایسی ہی بیسیوں مثالیں ہیں جن کی بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ آپ نے اپنے شاگردوں کو آگے بڑھانے میں خصوصی توجہ اور فراخدلی سے کام لیا۔

علمی شغف آپ کو ملازمت کے دوران بھی رہا جس کا اظہار الکشافہ کے ذریعہ آپنے کیا اسی طرح اقبالیات سے بھی آپ کو دلچسپی رہی۔ مذہبی کتابوں کا مطالعہ بھی آپ ہمیشہ کرتے رہے۔ آپ کے ذاتی کتب خانہ کو نمونہ کا کتب خانہ قرار دیا جاسکتا ہے جو اردو انگریزی کی معیاری کتب پر مشتمل ہے۔

جب وظیفہ حسن خدمت کے بعد آپ کو فرصت ہاتھ آئی تو آپ نے مذہبی کتب کی تصنیف کی جانب توجہ دی اور انگریزی زبان میں عام فہم انداز میں اسلام کو

پیش کرنے کی ذمہ داری لی۔ اس اہم اور مضمرات کے حامل کام کو آپ نے نہایت خوبی اور سلیقہ سے سرانجام دیا آپکی کتاب " ٹے نیٹس آف اسلام " پر تبصرہ کرتے ہوئے میں نے لکھا تھا۔

" علی موسیٰ رضا صاحب مہاجر کا شمار ان معدودے چند علما میں کیا جاسکتا ہے جن پر دنیائے اسلام فخر کرسکتی ہے۔ موصوف نہایت خاموش زندگی گذارتے تھے لیکن ہمیشہ خلوص کے ساتھ تحقیقی کاموں میں معروف رہتے تھے۔ زیر نظر کتاب نفس مضمون کے لحاظ سے کوئی تحقیقی کام نہیں ہے بلکہ اس میں بنیادی عقائد کا بیان ہوا ہے پھر بھی جا بجا تحقیقی شان جلوہ فرما نظر آتی ہے۔ گذشتہ تیرہ سو برس میں اسلام کے بارے میں مسلمان علما نے بے شمار کتابیں لکھی ہیں لیکن اس کتاب میں فاضل مصنف نے ہر عقیدہ سے متعلق عقلی دلائل پیش کئے ہیں اور ایسا شگفتہ انداز بیان اختیار کیا ہے کہ مضمون نہایت دلچسپ صورت اختیار کر گیا ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ تمام دنیا میں بالخصوص مغربی ممالک میں آپ کی کتابوں کی وسیع اشاعت ہو "

آپ کی دوسری تصانیف قصص قرآنی کے نصائح۔ اسلام کی اعلیٰ تعلیمات اسلام عملی زندگی میں۔ مسیح قرآن میں۔ محمد صلعم قرآن میں۔ عورت، قرآن اور دوسری کتب مقدسہ میں، کا بھی یہی حال ہے یہ تمام تصنیفات انگریزی میں ہیں۔

بیسویں صدی اپنے ساتھ مسلمانان عالم کے لئے ان گنت مسائل لے کر آئی افسوس کہ اس صدی کے تین ربع حصے گزرنے کو آگئے لیکن ان مسائل کو حل کرنے

کے لئے کوئی منظم کوشش نہیں کی گئی اور اس صدی کی دیئے ہوئے چیلنج کو بہ حیثیت جماعت ہم نے قبول نہ کیا۔ اس صدی کی ابتداء میں اسی شہر حیدرآباد میں ڈاکٹر نسنی سکانت چٹوپادھیائے نے قبول اسلام کے بعد ۲۶ راگست ۱۹۰۴ء کو یہ تجویز پیش کی۔

"میں یقین کے ساتھ یہ محسوس کرتا ہوں کہ اگر حیدرآباد میں اسلام کے سیدھے سادے اصولوں اور ٹھوس حقیقتوں کی وسیع پیمانہ پر اشاعت کرنے والے اسلامی مشن قائم کئے جائیں جو یورپ، امریکہ اور جاپان کے لوگوں کو اسلام کے سادہ و سچے اصولوں کی تبلیغ کریں تو اسلام کی صفوں میں ایک ایسا زبردست اضافہ ہوگا جس کو دنیا نے پہلی صدی ہجری کے بعد شاید ہی کبھی دیکھا ہو"۔

آج ۱۹۷۰ء میں ہم جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اہل حیدرآباد نے ایسا کوئی مشن قائم نہیں کیا۔ اور نہ دنیا نے ایسی کوئی ہلچل دیکھی جس کا خواب نسنی سکانت چٹوپادھیائے نے دیکھا تھا اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ حیدرآباد میں کرنے کے لئے کام رہ گئے لیکن کوئی بات دین کے فائدے کی نہ تھی جو نہ کی گئی ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ باتیں ان سنی کردی گئیں عوام نے جن بڑی شخصیتوں کو عقیدت و احترام کے بلند مقامات عطا کئے اور شاہوں نے جن کو فکر معاش سے آزاد کر کے دین کی خدمت کے لئے مختص کردیا۔ انھوں نے دین کے نام پر کیا حاصل کیا یہ تو حیدرآباد کی تاریخ بتلائے گی لیکن دین کے لئے انھوں نے کیا خدمات انجام دیں یہ خود ان سے پوچھئے جو جواب نہ دے سکیں گے انھیں

حساب ضرور دینا ہوگا۔ انکی خدمات کے مقابلہ میں علی موسیٰ رضا مہاجر کی خاموش اور پرخلوص خدمات کتنی زیادہ قابل قدر ہیں اس کا اندازہ ان کے علمی کارناموں کو دیکھ کر کیا جا سکتا ہے وہ اس سے بے نیاز رہے کہ دین کی خدمت کے نام پر ان کو کیا ملا ان کے پیش نظر تو صرف یہ تھا کہ وہ خود دین کی کیا خدمت انجام دے سکتے ہیں۔

علی موسیٰ رضا مہاجر ان لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے دین کے نام پر نہ دنیوی عزت حاصل کیا نہ نام کمایا۔ ان کی کوئی خانقاہ تھی نہ معاش لیکن دین کی خدمت انھوں نے خاموشی اور انہماک سے کی جو کچھ اپنی محنت سے اور چھوٹی سی ملازمت میں کمایا اس کو اپنے تبلیغی مشن پر صرف کیا فکر معیشت کے بعد جو وقت ملا اس کو بھی دین کی نذر کیا۔ وہ خود اپنی جگہ ایک مشن اور ایک ادارہ تھے۔ پیشہ وراں دین کے آگے مصلحتوں کے سر جھک جاتے ہیں۔ دین کی ماہیت کو سمجھنے والا دماغ اور دین کی محبت رکھنے والا دل نہیں جھک سکتا لیکن علی موسیٰ رضا مہاجر جیسی دین کی پرخلوص خدمت کرنے والی شخصیتوں کے آگے تسلیم کے سر بھی جھک جاتے ہیں اور عقیدت و احترام کے جذبات کے ساتھ دل و دماغ بھی۔!

مردِ تنہا

اگر وقت آئے اور قرآن کی تعلیم اور اس کی علمی توجیہہ کے لئے کوئی یونیورسٹی قائم کی جائے تو حیدرآباد کے بزرگ اور قرآنیات کے عالم میر ولایت علی صاحب اس کے پورے مستحق ہیں کہ انھیں اس جامعہ کا پروفیسر مقرر کیا جائے۔ انھوں نے خود کسی جامعہ میں تعلیم حاصل نہیں کی۔ انگریزی یا عربی زبان پر عبور نہیں رکھتے مگر مدرسہ تدبر و تفکر فی القرآن کے مخلص طالب علم ہیں اور زمانہ طالب علمی ۵۰ سال ہے۔ میر صاحب کو صاحب قرآن تعالےٰ جل شانہٗ کی بارگاہ سے اپنی مادری زبان اردو میں فہم قرآن و اشاعت مضامین امن و سلامتی کی غیر مرئی سند حاصل ہے جو یقیناً ایک بڑی سعادت ہے۔

یہ قدرت کا قانون ہے کہ جس بندے میں علم کی طلب صادق موجود ہو اس کا شرح صدر ہوتا ہے اور اس کو قدرت کے بے پایاں علم کا مناسب حصہ عطا ہوتا ہے۔ میر صاحب کے دل میں تڑپ پیدا ہوئی اور انھوں نے جستجو کی تو ان پر قرآن کے نکات ظاہر ہوئے۔ علم خدا کی دین ہے۔ یہ تعلیمی ڈگریوں کا پابند نہیں ہوتا جس طرح اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ نہ تو مولوی سے ایمان مل سکتا ہے

نہ وکیل سے انصاف نہ ڈاکٹر سے صحت نہ سیاست دان سے اچھی حکومت۔ اسی طرح اب یہ بات بھی سچ ہوتی جارہی ہے کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں سے حقیقی علم بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ میر صاحب نے کھلے دل سے ہر مکتب خیال۔ ہر فرقہ ہر ڈگری یافتہ۔ ہر عمامہ و جبہ کے افراد سے سیکھنے کی کوشش کی۔ اور خلوص سے مملو دل میں پیدا ہونے والے ان گنت سوالات کو ان کے سامنے پیش کیا۔ لیکن ان سوالات کے جوابات ان میں سے کسی کے پاس نہ تھے۔ بلکہ ان سوالات سے ان کے مکتب خیال۔ ان کے فرقہ۔ ان کی ڈگریوں اور ان کے عمامہ و جبہ کا موقف نازک ہو جاتا تھا۔ تب میر صاحب پر یہ بات منکشف ہوئی کہ خود ان کو اپنے بل بوتہ پر حقیقت کی تلاش کرنی ہوگی۔ اور قرآن پر ڈالے گئے پردوں کو ہٹانا ہوگا۔

وہ شمع دیر تھی نہ حرم کا چراغ تھا
دل کا لہو جلا تو کہیں روشنی ملی

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ میر صاحب نے گذشتہ ۵۰ سال سے دل کا لہو جلانے کا سلیقہ سیکھا ہے۔ اگر مسلمان پیغمبر اسلام کا کہا مانتے ہوئے یہ نہ دیکھیں کہ کون کہہ رہا ہے بلکہ یہ دیکھیں کہ کیا کہہ رہا ہے تو وہ میر صاحب کے نقطہ نظر کو سمجھ سکیں گے اور ان کے نتائج سے مستفید ہو سکیں گے۔

میر ولایت علی صاحب ۹ ر اگست ۱۸۹۶ء کو نظام آباد میں پیدا ہوئے آپ کا تعلق وہاں کے انعام دار خاندان سے تھا جو زمانہ قدیم سے قاضی خطیب وغیرہ عہدوں سے ملقب تھا ابھی کم سن ہی تھے کہ والد ماجد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ کچھ ہی عرصہ بعد ملازمت سے منسلک ہو گئے۔ جون ۱۹۲۲ء میں شادی ہوئی۔ پھر حیدرآباد تبادلہ

ہوا۔ حیدرآباد میں معتمدی مالگزاری میں منتظمی کی خدمت پر فائز اور کارگزار رہے ۱۹۴۸ء میں ناکردہ گناہ کی پاداش میں ان کو قبل از وقت وظیفہ پر سبکدوش کر دیا گیا تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ انھوں نے رضاکار تنظیم ایک مضمون لکھا تھا جس میں رضاکاروں کی زیادتیوں کے خلاف آواز اٹھاتے ہوئے ان کو مشورے دیتے تھے بعد میں اس غلط فہمی کے تحت کہ یہ کبھی رضاکاروں کے حامی تھے ان سے صفائی کا موقعہ دیئے بغیر وظیفہ کی درخواست لی گئی پنشن لینے کے بعد انھوں نے کچھ عرصہ تک ریلیف کمیٹی میں ملا عبدالباسط صاحب کے ساتھ کام کیا پھر قدیم ادارہ یتیم خانہ انیس الغربا میں آٹھ نو سال تک بحیثیت معتمد ادارہ خدمت انجام دی۔

میر صاحب بچپن ہی سے مذہب کے دلدادہ اور نماز روزہ کے پابند تھے۔ مذہبی کتابوں کے مطالعہ کا غیر معمولی شوق تھا۔ ابتدا ہی سے ان میں جستجو اور تلاش حق کا مادہ تھا۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ جب قرآن نے ایک دین کو پیش کیا ہے تو پھر اسلام میں مختلف فرقے کیا ہوتے ہیں اور کیوں ہوتے ہیں۔ ۱۹۲۴ء کے لگ بھگ ان کی ملاقات غلام احمد صاحب سے ہوئی جو ایک معقول پسند اور آزاد فکر کے حامل تھے انھوں نے مسلمانوں کے بعض مروجہ غیر معقول عقائد پر چٹکیاں لینی شروع کیں اور ساتھ ہی علامہ مشرقی کی معرکتہ الآرا تصنیف "تذکرہ" کا ذکر کیا۔ اولاً تو یہ سمجھ کر کہ اس میں دہریت ہے اس کو پڑھنے سے اجتناب کیا۔ پھر اگلے سال رمضان کا مہینہ اپریل میں آیا۔ حیدرآباد کی حکومت میں شدت گرما کی وجہ سے رمضان میں دفاتر کو ایک ماہ کی چھٹیاں ملتی تھیں۔ میر صاحب ان چھٹیوں میں پڑھنے کے لئے "تذکرہ" اٹھالاتے کہ دیکھیں دہریئے کیا کہتے ہیں۔ جب ایک بار تذکرہ پڑھنا

شروع کیا تو اس خیال انگیز کتاب نے ان کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ اس کی تفصیل خود ان کی زبانی سنئے۔

"لطف مطالعہ اتنا بڑھا کہ اپریل کے روزے ہیں۔ مغرب کی اذان ہو رہی ہے والدہ محترمہ جن کی گود میں نماز روزہ کا پابند ہوا تھا فرماتیں میاں اذان ہو رہی ہے کتاب رکھ دو اور افطار کر لو۔ عرض کرتا اماں جان کچھ اور پڑھ لینے دیجئے اس میں افطار سے زیادہ لطف آ رہا ہے"
غرض تذکرہ اس ذوق سے پڑھا۔ جب ختم کیا تو علامہ مشرقی کی اس تفہیم نے کہ۔

"ختم رسل کا لایا ہوا دین بلا اختلاف قوم و مذہب ایک بھائی چارہ تھا۔ اس دین کو لوگ فرقہ بندی نہ سمجھتے تھے۔ نصرانیوں اور یہودیوں کے بالمقابل محمدی بننا اکثر نہ جانتے تھے۔ ان کے پیش نظر صرف قانونِ خدا کا عملاً مطیع بننا تھا، "مسلم" بننا تھا۔ خدا کے آخری رسول کو بت بنا کر ان کے پیچھے صف آرا ہو جانا نہ تھا"
ان کی زندگی کا نقشہ ہی بدل دیا۔ علامہ مشرقی سے یہ نسخہ بھی ہاتھ لگا کہ۔

"قرآن مربوط و مسلسل ہے۔ نااہلوں کے ہاتھوں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ناقابل فہم ہو گیا ہے۔ قرآن کا یہ معجزہ ہے کہ وہ اپنا آپ مفسر ہے جس آیت پر اختلاف پیدا ہو گیا ہے۔ اس سے پہلے اور بعد کی آیات کو دیکھ کر ربط کلام پر غور کیا جائے تو اس کا صحیح مفہوم کھل کر سامنے آجاتا ہے نیز قولِ خدا اختلاف سے پاک ہے اور قولِ خدا اور فعلِ خدا میں پوری یکسانیت ہے۔ ربط کلام پر غور کرنے کے

باوجود اگر کسی آیت کے مفہوم کو سمجھنے میں دشواری محسوس ہو تو اس کو فعل خدا میں دیکھو جو کائنات عالم میں آفتاب عالم تاب کی طرح پھیلا ہوا ہے اس سے تعصب کی جڑ کٹتی ہے۔ اور اتحاد عالم کا نور دماغ کو منور کر دیتا ہے۔"

اب میر ولایت علی صاحب کی سمجھ میں آیا کہ اللہ سب کا ہے جو جزا و سزا میں عادل و منصف ہے۔ انسان کا نادار و فرحاں ہونا اس کے اپنے کام و کسب پر موقوف ہے۔ نام و نسب کی کوئی قیمت نہیں۔

"تذکرہ" ہی کے اثر کے تحت انھوں نے خاکسار تحریک میں شرکت کی۔ اور ان کو حیدرآباد کا سالار اعلیٰ مقرر کیا گیا۔ علامہ مشرقی نے اپنے اخبار الاصلاح لاہور یکم جنوری ۱۹۳۷ء میں ان کے متعلق فرمایا۔

"محترم میر ولایت علی تحریک کے وہ مجاہد اعظم ہیں جن کے ولولے نے مجھے بارہا خدا یاد دلایا ہے۔ ان کو دیکھ کر خدا یاد کرنے سے میرا دل کئی دفعہ لرزا ہے۔ ان کی صحبت میں بیٹھ کر میں نے کتنی دفعہ نور ایمان حاصل کیا ہے۔"

ایک جلسۂ شب قدر میں ان کی تقریر کا اعلان ہوا تھا۔ آیت کلام پاک ــــ

وَاللّٰہُ الْغَنِیُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ ثُمَّ لَا یَکُوْنُوْٓا اَمْثَالَکُمْ ۝ (سورۃ محمد ۴۷/۳۸)

کے سنگ میں تقریر کی۔ اور ایک ملکی سی وضاحت سے مسلمانوں کو جھنجھوڑا۔ مستقبل کے مصائب کی نشاندہی کی اور درستی اعمال کی طرف متوجہ کیا۔ عوام تو کچھ نہ کچھ متاثر ہوئے ہوں گے مگر ایک مولوی صاحب نے الٹا اثر لیا فوراً اٹھ کر پر زور تردید شروع

کر دی۔ اور من قال لاالٰہ الا اللہ کا مروجہ غلط مفہوم سمجھا کر بے عملوں کو لفظی ایمان کا سبز باغ دکھلایا گویا مارفیا کا انجکشن دیدیا۔ غلام احمد صاحب جو اس جلسہ میں موجود تھے موقع کی نزاکت کو سمجھ گئے اور قریب آکر کہا، ولایت خاموش رہو۔ مولوی صاحب کے خلاف کچھ نہ کہو ورنہ جہلا مشتعل ہو جائیں گے۔ آئندہ تقاریر بند کردو۔" نام نہاد اسلامی سلطنت تھی عقیدہ پرست ملاؤں کا زور تھا میر صاحب نے دل پر جبر کر کے ان کے مشورہ کو قبول کر لیا۔

۱۹۴۸ء میں انھوں نے ادارہ علمیہ قائم کیا اور اس کے ذریعہ صحت مند خیالات اور صحیح مفہوم قرآنی کو عام کرنے کی کوشش کی۔ اور اپنے خیالات کو اپنی کتاب اسلامی تعلیمات اور صدہا مضامین اور خطوط کے ذریعہ اہل نظر تک پہنچانے کی کوشش کی۔ ان کی کتابیں مکتوبات ولایت (۱۹۶۵ء) قرآن اور انسان ... (۱۹۶۷ء) قرآنی تعلیمات ۱۹۷۰ء بھی اس سلسلہ کی کوششیں ہیں انھوں نے پیام مشرق کے نام سے علامہ مشرقی کی تصانیف کا خلاصہ شائع کیا نیز غلام احمد پرویز کی کتاب نظام ربوبیت کا خلاصہ بھی شائع کیا۔

جب مئی ۱۹۶۱ء میں اندور اور لکھنؤ کے سالاروں نے خاکسار تحریک کا احیاء کیا تو ان کو سالار خاص ہند منتخب کیا۔ انھوں نے بطیب خاطر اس کو قبول کیا جب عوام میں احساس پیدا نہ کر سکے تو عہدہ چھوڑ دیا۔

میر ولایت علی صاحب کی زندگی کے پچھلے پچاس سالوں پر نظر کی جائے تو معلوم ہوگا کہ ایک طرف تو تلاش حق جاری ہے اور دوسری طرف اپنے معقول نقطۂ نظر کو عوام کے اور خصوصاً مسلمانوں کے سامنے رکھنے کی سعی مسلسل ہے۔ اس

احتیاط اور اس انداز سے کہ علمائے تقلید کی ملامت کا ہدف نہ بن جائیں۔ اس دوران ان کو غلط سمجھا گیا۔ ان کی نیت پر اور ان کے خلوص پر شبہ کیا گیا۔ ان کے عقائد کو کفر سے نسبت دی گئی۔ ان پر انگلیاں اٹھائی گئیں۔ مخالفتیں کی گئیں۔ لیکن اس تمام عرصہ میں انھوں نے اپنے نقطۂ نظر کو کافی پھیلایا۔ ان کا کام اس نوعیت کا ہے کہ اگر ان کی باتوں کو جزوی طور پر بھی ان لیا جائے تو ان کا مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔ اندھیرے میں تھوڑی روشنی بھی کافی ہوتی ہے۔

گزشتہ پچاس سال میں حالات کافی تبدیل ہو گئے ہیں۔ عالم اسلام میں اور خاص طور پر ہندوستانی مسلمانوں کے مذہبی خیالات میں ایک حد تک... بیداری پیدا ہوئی ہے۔ ذہن صاف ہو رہے ہے۔ آزادی فکر کا بول بالا ہو رہا ہے جس کی اجازت خود اسلام نے دے رکھی ہے۔ جن باتوں کو میر ولایت علی صاحب نے تن تنہا کہنا شروع کیا تھا قریب قریب ویسی ہی باتیں اب جماعتیں کہہ رہی ہیں لیکن ان کی باتوں پر جماعتی مصلحتوں کے پردے ہیں۔ جماعتی مفادات پیش نظر ہیں۔ آج بھی میر ولایت علی صاحب تنہا ہیں۔ آج بھی میر ولایت علی صاحب کا کام مشکل ہے اور نازک ہے۔

معیاری مدبر

بیرسٹر اکبر علی خاں کا شمار ان چند حیدرآبادیوں میں کیا جاتا ہے جن پر ہمارے کلچر اور تمدن کو ناز ہو سکتا ہے۔ جب اہل حیدر آباد نے یہ خبر سنی کہ حیدر آباد کے ساتویں شہری کی حیثیت سے آپ کو اتر پردیش کا گورنر مقرر کیا گیا تو عام تاثر یہ رہا کہ حق بہ حق دار رسید، اور دیر آید درست آید۔

جاننے والے جانتے ہیں کہ حکومت ہند گورنری کا جلیل القدر عہدہ یوں ہی نہیں دے دیتی۔ اس عہدہ تک پہنچنے کے لئے میر اکبر علی خاں کو خدمت و خلوص کا مجسمہ بننا پڑا جو ہمیشہ ان کی طبیعت ثانیہ رہی۔ اصولوں اور اقدار کی پابندی کرنی پڑی جو ہمیشہ انکا شعار رہا وضعداری اختیار کرنی پڑی جو انکی فطرت ہی صلح کن پالیسی پر عمل پیرا ہونا پڑا جو ہمیشہ انکا طریقہ کار رہا عوامی اور اردو کو چلانے میں وہ جس مثالی کردار کا ثبوت دیتے رہے ہیں وہ دوسرے کام کرنے والوں کے لئے آج نمونہ بن چکا ہے۔

بہت کم لوگ اس بات کو جانتے ہیں کہ ۱۹۴۰ء میں محمد علی جناح نے آپ کو مجلس اتحاد المسلمین میں شرکت کا مشورہ دیا تھا لیکن آپ نے اسے قبول نہیں کیا پھر ۱۹۴۷ء میں آپ کو وزارتِ عظمیٰ کی پیش کش ہوئی اور شرط یہ رکھی گئی تھی کہ

آپ مجلس میں شرکت کریں گے، چوں کہ آپ اصولی طور پر مجلس کے طریقۂ عمل سے اختلاف رکھتے تھے اس لئے آپ نے اس کو قبول نہیں کیا۔ اصولوں کی خاطر ایثار کی اس سے بہتر اور کیا مثال ہوگی۔

اس سال[1] ۱۱؍ فروری کو جب آپ وِلا اکیڈمی کی مطبوعات کی رسم اجرا کے جلسہ کی صدارت فرما رہے تھے تو میں نے خیر مقدم کرتے ہوئے کہا تھا۔

"زندگی کی اعلیٰ قدروں سے لگاؤ اور اصول پرستی کے جذبہ نے میر اکبر علی خاں کو سیاست کے میدان میں لا کھڑا کیا۔ وہ حیدرآباد کی اس تہذیب کے علمبردار ہیں جو ہم کو برصغیر میں ایک ممتاز درجہ سے نوازتی ہے"۔

بیرسٹر اکبر علی خاں صاحب کا تعلق حیدرآباد کے سربرآوردہ اور قدیم جاگیردار گھرانے سے ہے۔ آپ کے والد ماجد میر محبوب علی خاں صاحب کا شمار حیدرآباد کے وضع دار جاگیرداروں میں ہوتا تھا۔ آپ ۷؍ نومبر ۱۸۹۹ء کو شہر حیدرآباد میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم مفید الانام ہائی اسکول میں حاصل کی۔ جس کے قیام میں راجہ بنسی لال اور خود آپ کے اہلِ خاندان کا حصہ رہا۔ سٹی ہائی اسکول سے میٹرک کا امتحان کامیاب کر کے علی گڑھ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر رہے تھے کہ ۱۹۲۰ء میں مہاتما گاندھی اور علی برادران کے مشورہ پر تعلیم ترک کر دی۔ ان دنوں ڈاکٹر ذاکر حسین قوم پرست طلباء کی رہنمائی کر رہے تھے۔ حیدرآباد کا ایک وفد سر اکبر حیدری کی قیادت میں علی گڑھ گیا جس میں نواب سر راس مسعود، لطیف یار جنگ مولوی حبیب الرحمٰن شیروانی بھی تھے۔ اس وفد کا مقصد یہ تھا کہ علی گڑھ میں تعلیم پانے والے حیدرآبادی طلباء کو ترک موالات کی تحریک میں شرکت سے

---

[1] ۱۹۷۲ء

بلا زرکھا جائے لیکن حیدر آباد کے آٹھ دس طلباء نے وفد کی اس تجویز کو ماننے سے انکار کر دیا جن میں میر اکبر علی خاں بھی تھے۔ اس طرح یہ وفد ناکام رہا۔

علی گڑھ سے واپس آکر آپ نے ۱۹۲۳ء میں جامعہ عثمانیہ سے بی۔اے کی تکمیل کی اور اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان روانہ ہوئے۔ انگلستان میں لندن یونیورسٹی سے ایل۔ایل۔بی (آنرز) اور مڈٹمپل سے بارایٹ لاء کی تکمیل کی۔ ۱۹۲۷ء میں واپس آکر بحیثیت ایڈوکیٹ پیشہ وکالت سے منسلک ہوئے۔ مولوی احمد شریف رائے بشیشور ناتھ سر تیج بہادر سپرو اور سری نواس آئنگار کے جونیر کی حیثیت سے کام کرنے کے مواقع حاصل ہوئے۔

اس وقت حیدر آباد میں قوم پرست نوجوانوں نے پروگریسو گروپ قائم کیا جس میں ایم نرسنگ راؤ۔ بی رام کشن راؤ۔ علی یاور جنگ۔ بیرسٹر سری کشن۔ فضل الرحمٰن۔ راماچاری اور کاشی ناتھ راؤ ویدیہ وغیرہ شریک تھے۔

حیدر آباد میں دستوری اصلاحات کا کمیشن قائم ہوا تو غیر سرکاری اراکین کی کمیٹی تشکیل پائی جس میں کاشی ناتھ راؤ ویدیہ، ہنمنت راؤ اور نواب بہادر یار جنگ کے ساتھ آپ کو بھی شریک کیا گیا۔ باوجود باہمی اختلاف رائے کے نواب بہادر یار جنگ آپ سے بہت خلوص رکھتے تھے اور باہمی تعلقات بہت قریبی اور دوستانہ رہے۔

بیرسٹر سری کشن نے جب ملکی تحریک شروع کی تو آپ اس کے روح رواں رہے اس تحریک کو نواب سر نظامت جنگ کی تائید حاصل رہی۔ انھیں کی کوششوں کے نتیجہ کے طور پر ملکی رولز نافذ ہوئے۔

آپ کو امور بلدیہ سے بھی دلچسپی رہی۔ اور اس وقت جب کہ مہدی یار جنگ مجلس بلدیہ کے صدر تھے تو آپ نائب صدر تھے۔

۱۹۳۶ء میں عثمانیہ گریجویٹس اسوسی ایشن کا قیام عمل میں آیا ابتدا ہی سے آپ اس سے وابستہ رہے اور اس کی معاشی کمیٹی اور نمائش کمیٹی کے رکن اور صدر کی حیثیت سے نمایاں خدمات انجام دیں ۔

آپ سترہ سال تک مجلس اتحاد ترقی کے صدر رہے یہ ایک غیر فرقہ وارانہ ادارہ تھا ۔ جب مجلس اتحاد المسلمین نے اقتدار حاصل کیا تو اس ادارہ کو طرح طرح کی مشکلات پیش آئیں ۔

۱۹۳۹ء میں سری نواس آئنگار کے مشورہ سے آپ نے ہندو مسلم اختلافات کو ختم کرنے کے لئے ایک اسکیم مرتب کی اور اس کو ایک جانب مہاتما گاندھی ۔ پنڈت نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد کے سامنے ، اور دوسری جانب بہادر یار جنگ کے توسط سے محمد علی جناح کے سامنے پیش کیا ۔ لیکن دوسری جنگ عظیم کے آغاز کی وجہ سے اس پر تفصیلی غور نہ ہو سکا ۔ ۱۹۴۸ء میں جب حیدرآباد میں انڈین نیشنل کانگریس کا پہلا جلسہ منعقد ہوا تو آپ کو مجلس استقبالیہ کا نائب صدر مقرر کیا گیا ۔ سوامی رامانند تیرتھ اس کے صدر تھے ۔

۱۹۵۲ء میں آپ کو جامعہ عثمانیہ کی سینٹ کا رکن مقرر کیا گیا
اس وقت آپ علی گڑھ یونیورسٹی ۔ جواہر لال یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ کے رکن ہیں ۔

۱۹۵۰ء میں آپ نے حیدرآباد پالی ٹیکنک کالج کی ابتدا کی ۔ گذشتہ ۱۶ سال سے یہ ادارہ کامیابی سے چل رہا ہے ۔

ریاستوں کی تنظیم جدید کے کمشن نے یہ مشورہ دیا کہ ابتدائی پانچ سال تک

تلنگانہ کی علیحدہ ریاست قائم کی جائے۔ چنانچہ وینکٹ رنگا ریڈی صاحب نے علیحدہ ریاست کا مطالبہ کیا۔ اور ایک تحریک چلائی۔ آپ اس تحریک سے وابستہ رہے اس سلسلہ میں پنڈت نہرو مولانا آزاد اور گوبند ولبھ پنت سے تلنگانہ قائدین رنگا ریڈی، چودھری نرسنگ راؤ اور ڈاکٹر چنا ریڈی سے ملاقاتیں ہوئیں۔ ان میں تلنگانہ کے مطالبات کی ترجمانی کے فرائض آپ ہی نے انجام دیئے لیکن جب ۱۹۶۹ء میں علیحدہ تلنگانہ تحریک چلائی گئی تو آپ نے اس سے اصولی اختلاف کیا آپ نے یہ محسوس کیا کہ تلنگانہ کے عوام کے ساتھ کافی ناانصافیاں ہوئی ہیں مگر اس مرحلے پر علیحدہ ریاست کے قیام کو تلنگانہ کے لئے مضر قرار دیا۔ اور اپنے نقطہ نظر کو نہایت بے باکی کے ساتھ پیش کیا۔

آپ نے اقوام متحدہ میں کرشنا مینن کی رہنمائی میں ہندوستان کی نمائندگی کی۔ اور چین کو جو خیر سگالی مشن اننت سائیم آئنگار کی صدارت میں گیا تھا۔ اس میں بھی آپ شریک تھے۔ ماسکو، فن لینڈ، ایشیا، افریقہ اور یورپ کے دوسرے ممالک کو جو وفد گئے ان میں آپ شامل تھے۔ آپ اٹھارہ سال تک راجیہ سبھا کے رکن رہے جسکے منجملہ بارہ سال نائب صدر رہے۔ کانگریس پارلیمانی بورڈ کے ڈپٹی لیڈر رہے جب کہ مسز گاندھی اس کی لیڈر تھیں۔

حیدرآباد کا مالی سال سنہ فصلی کی پہلی آذر کو شروع ہوتا تھا اور اب سے کوئی پینتیس برس پہلے مختلف فرقوں کے آپس کے اتحاد کو بنائے رکھنے کے لئے اس دن سال نو منانے کا انتظام کیا گیا تھا اور حضور نظام نے اس تحریک کی ستائش کرتے ہوئے اپنے فرمان میں اس یقین کا اظہار کیا تھا کہ ایسی تقاریب

اور آپس کے میل جول سے "حیدرآبادیت" اور "تمدن ومعیشت" کی بنیادیں بھی مستحکم ہوجائیں گی۔ کئی سال تک یہ جشن منایا جاتا رہا اس جشن کی کامیابی میں بیرسٹر میر اکبر علی خاں صاحب کی بے باک کوششوں کا بڑا دخل تھا۔

جاپان کے بابائے اردو

۱۹۵۴ء میں جب میں جاپان جا رہا تھا تو میرے کرم فرما جناب نصیر الدین ہاشمی نے مجھے ایک پتہ دیا اور مجھے ہدایت کی کہ میں ان صاحب سے ضرور ملوں ۔ میں نے اس ہدایت پر عمل کرتے ہوئے وقت مقرر کر کے اپریل ۱۹۵۴ء میں پروفیسر آر۔ گاموصاحب سے ملاقات کا شرف حاصل کیا ۔ دوران گفتگو پروفیسر صاحب نے اپنی کارگذاریوں کے بارے میں کچھ زیادہ باتیں نہیں کیں ۔ انھوں نے مجھ سے اردو کتابیں بھیجنے کی خواہش یا فرمائش بھی نہیں کی ۔ اپنی مشکلات اور اردو کتابوں کی عدم دستیابی سے پیدا شدہ صورت حال کا یوں ہی کچھ تذکرہ فرمایا لیکن جو لوگ انہماک اور خلوص رکھتے ہیں وہ اپنے مخاطب پر ضرور کچھ نہ کچھ اثرانداز ہوتے ہیں اور کم کہتے ہوئے بھی بہت کچھ کہہ دیتے ہیں ۔ پروفیسر آر۔ گاموکی شخصیت اور اردو سے ان کے شغف نے مجھے بے حد متاثر کیا میں جب باہر آیا تو بیرونی ممالک کو اردو کتابوں کی ترسیل کی تحریک جنم لے چکی تھی ۔ آج یہ سوچتا ہوں کہ کیوں کر چار ممالک جاپان ۔ اسرائیل چیکوسلواکیہ اور روس میں اردو کتب خانے قائم ہوئے تو میرا دل چاہتا ہے ۔ کہ اس تمام کام کا سہرا اس

شخص کو دوں، جس کی اردو زبان سے محبت اور دلی لگاؤ نے مجھے اس کام کا آغاز کرنے کے لئے بے چین کر دیا۔

دوران ملاقات میں نے محسوس کیا کہ اس شخص نے سرحدوں اور سمندروں کو پار کر کے صرف زبان ہی نہیں سیکھی، زبان بولنے والوں کے ماحول، تہذیبی پس منظر اور ذہن کو بھی سمجھا۔ اس اجنبی زبان کے مزاج کو اپنایا۔ ایک بدیسی زبان کو سیکھنا ہی بڑا مشکل کام ہے مگر اس میں استادی کے مقام پر پہنچنا اور ساولیت حاصل کرنا۔ یہ صرف گاموہی کر سکتے تھے۔ زبان کو رہنے دیجئے۔ ہمارے رسم الخط کی مشکلات کا اندازہ کیجئے پھر ایک دور دیس کے یکہ وتنہا نوجوان کی مشکلات کا اندازہ کیجئے جسے نہ ماحول حاصل ہے نہ کوئی سکھانے والا وہ جستجو کرتا ہے نہ جانے کیسی دشواریوں کا سامنا کرتا ہے کیا کیا طریقہ اختیار کرتا ہے کتنی محنت کرتا ہے اور بالآخر جو کمال حاصل کرتا ہے وہ یقیناً محیر العقل ہے۔ گامو صاحب خوش خط ہیں ان کے خط کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے موتی پرو دئے ہوں۔

اگر پروفیسر آر۔ گامو کو جاپان کا بابائے اردو کہا جائے جیسا کہ میں نے کہا ہے یا تو دان کے شاگرد سوزوکی تاکیشی نے کہا ہے تو یہ محض خوش عقیدگی نہیں بلکہ حقیقت پر مبنی ہے۔ ہاں ہمیں گامو صاحب سے بے پناہ عقیدت ہے جو ان کی اردو دوستی اور خدمت کی وجہ سے ہے۔

پروفیسر گامو صاحب ۲۷ نومبر ۱۹۰۱ء کو جاپان کے مغربی علاقہ میں واقع صوبہ شیمانے کے شہر یاتسوے میں پیدا ہوئے ۱۹۲۲ء میں ٹوکیو گائیکوکوگو اسکول یعنی بیرونی زبانوں کے مدرسہ کے شعبہ ہندوستانی کا امتحان پاس کرنے کے بعد نومبر ۱۹۲۵ء

میں اسی اسکول میں لکچرر بن گئے آپ نے اردو ہری ہرناتھ صاحب اور ان کے بعد مہری ٹورامنڈ صاحب سے سیکھی تین سال کے بعد مددگار پروفیسر اور ۱۹۳۴ء میں پروفیسر ہو گئے ۔

ٹوکیوگائیکوکوگو اسکول ۱۸۹۹ء میں قائم کیا گیا۔ اسی اسکول میں ۱۹۰۸ء میں عارضی طور پر ایک سال کے کورس کا شعبۂ ہندوستانی کھولا گیا ایک سال میں صرف پانچ طلبا کو داخلہ ملتا تھا اس شعبہ کو ترقی دے کر ۱۹۱۱ء میں ایک شعبہ کی حیثیت دی گئی اور تعلیمی سال میں بھی دو سال کا اضافہ ہوا ۔

شروع شروع میں شعبہ میں کوئی جاپانی پروفیسر نہیں تھا ٹوکیو میں رہنے والے ہندوستانی اصحاب میں سے یوپی کے ہری ہرناتھ صاحب کو منتخب کرکے ان کو پروفیسر بنایا گیا تھا پروفیسر گاموصاحب شعبہ میں پہلے جاپانی پروفیسر ہیں جن کو باقاعدہ استاد کی حیثیت سے نامزد کیا گیا۔ اسی بنا پر ان کو شعبہ ہندوستانی کے بانی اور جاپان کے بابائے اردو وفارسی کہہ سکتے ہیں۔ فی الحال جاپان میں اردو زبان و ادب، فارسی زبان وادب کے جتنے پروفیسر اور معلم موجود ہیں وہ سب کے سب یا تو براہ راست یا بالواسطہ گاموصاحب کے شاگرد ہیں ان ہی کی محنت و شفقت سے جاپان میں اردو اور فارسی کی باضابطہ تعلیم کا آغاز ہوا ۔

پروفیسر صاحب ۱۹۲۶ء سے ۱۹۲۸ء تک مطالعہ کے مقصد سے ایران، ہندوستان اور یورپ گئے ۔ ۱۹۲۶ء میں آپ پہلی بار ہندوستان تشریف لائے کلکتہ پہنچنے کے بعد وارانسی ۔ لکھنؤ ۔ الہ آباد ۔ دہلی ۔ آگرہ ۔ لاہور کے علاوہ یوپی اور پنجاب کے بڑے شہروں کا سفر کرتے ہوئے بمبئی اور یورپ روانہ ہو گئے ۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد ۱۹۴۹ء میں ٹوکیو گائیکو کوگو اسکول کو بند کر کے ٹوکیو گائیکو کوگو یونیورسٹی یعنی جامعہ ٹوکیو برائے زبان ہائے خارجی کا قیام عمل میں لایا گیا اور پروفیسر گاموصاحب اس نئی یونیورسٹی کے شعبۂ ہندوستان و پاکستان کے پہلے صدر مقرر ہوئے۔ طلبار کی تعداد میں بھی اضافہ کیا گیا اور ہر سال پندرہ طلبار وطالبات کو سخت امتحان کے بعد داخلہ ملنے لگا۔ گاموصاحب اواخر مارچ ۱۹۶۴ء تک عہدۂ صدارت پر رہے اور یکم اپریل کو مستعفی ہو گئے یونیورسٹی بورڈ نے فوراً ان کو اعزازی پروفیسر کا خطاب پیش کیا اور حکومت نے جاپان میں اردو اور فارسی کی تعلیم میں ان کی بیش بہا خدمات کے اعتراف میں تمغہ" طلوع آفتاب ،، درجہ سوم عطا کیا۔ علیحدگی کے بعد پروفیسر صاحب دو سال تک ٹوکائی یونیورسٹی کے شعبہ ادبیات میں پروفیسر رہے۔ وہ ٹوکیو یونیورسٹی ٹورتسو یونیورسٹی وغیرہ کئی جامعات میں علم اسلامیات فارسی زبان وادب پڑھانے کے لئے لکچرر بن چکے تھے۔ وہ کئی سال سے جاپان اورینٹل اسٹڈیز ایسوسی ایشن اور انجمن ایران کے رکن بھی ہیں۔

پروفیسر صاحب کی کئی تصانیف ہیں جس میں "قواعد اردو" "قواعد فارسی" "تاریخ ثقافت ایران،، "تاریخ ایران" "اسلام" "شعرار ایران، باغ وبہار کا جاپانی ترجمہ شیخ سعدی کے گلستاں کا ترجمہ وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں ان کے علاوہ علمی مضامین بھی بے شمار ہیں۔

پروفیسر صاحب نے قرآن پاک کا جاپانی میں ترجمہ شروع کیا تھا چند مجبوریوں کی وجہ سے اس کو مکمل نہ کر سکے۔ البتہ اپنی تصنیف "اسلام" میں جگہ جگہ سورتوں

کے ترجمہ کا اقتباس پیش کیا ہے ۔

۱۹۶۶ء میں آپ حکومت ایران کی دعوت پر ایران کا دورہ بھی کر چکے ہیں۔ پروفیسر گاموصاحب بڑی باوقار اور شاندار شخصیت کے حامل ہیں۔ کبھی بڑوں اور چھوٹوں میں تمیز نہیں کرتے ۔ طالب علموں سے کامل شفقت اور محبت سے پیش آتے ہیں سیاست سے دلچسپی نہیں اور بے ایمانی سے سخت نفرت ہے ۔ میوزیم میں عمدہ تصاویر اور مجسمے دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ ماہی گیری کا بھی شوق رہا ہے ۔ افسوس ہے کہ صحت ناساز ہونے کی وجہ سے آج کل گھر میں رہتے ہیں۔ ان کی تین صاحبزادیاں ہیں بیگم صاحبہ بھی بقید حیات ہیں ۔

انوکھا رفیوجی

تقسیم ہند کے وقت ہندوستان سے پاکستان جانے والے سب ہی مسلمان تھے اور پاکستان سے ہندوستان آنے والے سب ہی غیر مسلم اس میں کسی استثنائی شکل کا گمان بھی نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن ہر قاعدے کلیہ کے ساتھ استثنائی شکل ضرور ہوتی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ ہندوستان سے پاکستان جانے والوں میں کوئی استثنائی شکل تھی یا نہیں، لیکن پاکستان سے ہندوستان آنے والے لاکھوں غیر مسلموں میں ایک مسلمان بھی تھا جس نے گاندھی جی کو "پاکستان سے ہندوستان آنے والا انوکھا رفیوجی" کہنے پر مجبور کیا۔

یہ انوکھا رفیوجی دو قومی نظریے کا کٹر مخالف تھا۔ وہ بنیادی اصولوں میں سمجھوتہ کرنے کا قائل نہ تھا۔ سنت نبویؐ کی اتباع میں میٹھا رغبت سے کھانا اور خوشبو لگانا بہت سوں کو آتا ہے لیکن اصول اور مقصد کی خاطر وطن کو خیرباد کہنا اور رشتہ داروں کو نظر انداز کرنا پروفیسر عبدالمجید خاں کے سوا بہت کم کو نصیب ہوتا ہے۔

اگر ہم اس شخصیت کو نہیں پہچانتے اور اس کے ایثار اور اصول پسندی کی قدر نہیں کرتے تو قطعاً کوئی تعجب کی بات نہیں ہے ہم اس سے قبل بڑی

جرأت اور جسارت کے ساتھ ایسا کر چکے ہیں، اور دھڑلے سے کر چکے ہیں لیکن ہاتھ میں قلم ہو تو اس کی کچھ ذمہ داریاں بھی ہوتی ہیں اسی احساس نے یہ خاکہ مرتب کروایا کہ کوئی بات بن کہی نہ رہ جائے۔

پروفیسر عبدالمجید خاں یکم دسمبر ۱۹۰۲ء کو بٹالہ ضلع گورداس پور میں علماء کے ایک ممتاز خاندان میں پیدا ہوئے۔ آپ کے اجداد دو سو سال قبل غزنی سے پنجاب آئے تھے۔ آپ نے مقامی ایم۔ بی اسکول سے میٹرک پاس کیا اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ایف۔ اے کا امتحان پاس کر کے فورمین کرسچین کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ ۱۹۲۶ء میں آپ نے پنجاب یونیورسٹی سے انگریزی میں بی۔ اے آنرز کی سند حاصل کی اور ۱۹۲۹ء میں ایم۔ اے پاس کر کے فورمین کرسچین کالج لاہور میں شعبۂ انگریزی سے تعلق قائم کیا۔

دوران طالب علمی ہی سے غیر معمولی ذہانت کی وجہ سے اساتذہ آپ سے بے حد متاثر تھے۔ آپ کی عوامی خدمات کا سلسلہ طالب علمی ہی سے شروع ہوا ۱۹۲۸ء میں آپ اسٹوڈنٹس یونین کے صدر تھے۔ ۶/اکتوبر ۱۹۲۸ء کو طلباء کی کانفرنس کے صدر استقبالیہ کی حیثیت سے آپ نے جو خطبہ دیا تھا وہ تاریخی حیثیت رکھتا ہے اس میں آپ نے طلباء برادری کو فرقہ پرستی کے خلاف جنگ کرنے اور ملکی مفادات کے لئے قربانی دینے کا مشورہ دیا تھا۔ اس خطبہ کو ملک بھر میں سراہا گیا لیکن لالہ لاجپت رائے نے ۱۱/اکتوبر ۱۹۲۸ء کے "پیپل" میں شاندار الفاظ میں اس کا ذکر کیا۔ ۳۲-۱۹۳۲ء میں آپ آل انڈیا انٹی کمیونل لیگ کے سکریٹری بنے۔ ۱۹۳۴ء میں سودیشی لیگ کے وائس پریزیڈنٹ

اور ۱۹۳۸ء میں آل انڈیا ریٹ پیئرز ایسوسی ایشن کے سکرٹری رہے۔

۱۹۴۰ء میں رجسٹرڈ گریجوٹیس کے حلقہ انتخاب سے سینیٹ کی رکنیت کے لئے آپ نے مقابلہ میں حصہ لیا اور کامیابی حاصل کی۔ ۱۹۴۵ء کے سینیٹ کے انتخاب میں بھی آپ نے کامیابی حاصل کی۔ ہر دفعہ گاندھی جی نے شخصی طور پر آپ کو آشیر واد دی۔ ۱۹۴۶ء میں جب عارضی حکومت کی تشکیل کا وقت آیا تو وزارت کی دو مسلم نششتوں کے لئے جو پیش قیاسیاں ہوئیں ان میں جناب فخرالدین علی احمد کے ساتھ آپ کا نام بھی تھا (ملاحظہ ہو اخبار اسٹیٹسمن مورخہ ۳۰ راگست ۱۹۴۶ء) ۱۹۴۷ء میں جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے آپ ہندوستان آگئے۔ نومبر ۱۹۴۷ء میں اور اکتوبر ۱۹۵۲ء میں مشرقی پنجاب یونیورسٹی کے دوبار رکن منتخب ہوئے نومبر ۱۹۴۷ء سے جون ۱۹۴۸ء تک آپ ہندو ایران کلچرل سوسائٹی کے سکرٹری رہے۔ جون ۱۹۴۸ء سے مارچ ۱۹۵۲ء تک جدہ سعودی عربیہ میں حکومت ہند کی جانب سے قونصل رہے ۱۹۵۲ء نومبر سے جون ۱۹۵۵ء تک آپ کو مشہد (ایران) میں ہندوستان کا قونصل جنرل مقرر کیا گیا اور ڈھائی سال تک آپ نے ملک کی نمائندگی کے فرائض انجام دیتے۔ ۱۹۶۰ء میں آپ کو پنجاب پبلک سروس کمیشن (پٹیالہ) کا رکن مقرر کیا گیا اور جنوری ۱۹۶۳ء تک اس عہدہ پر فائز رہے آپ پنجاب مسلم وقف بورڈ کے رکن رہے اور مسلم ٹرسٹ کمیٹی شملہ کے بھی رکن ہیں۔

پروفیسر صاحب بنیادی طور پر ایک عالم ہیں۔ انگریزی میں آپ کی بلند پایہ تصانیف عالمی شہرت کی حامل ہیں۔ آپ کی تصنیف **Vital Islam** ایسا شاہکار ہے جس کو ڈاکٹر سید عبداللطیف کی کتاب "وہ ذہن جس کی قرآن تعمیر کرتا ہے

کے ساتھ اسلام کو اہلِ مغرب کے سامنے شاندار طریقے پر پیش کرنے والی تصنیف
قرار دیا جا سکتا ہے۔

آپ کی دوسری تصانیف "ہندوستان کی عظیم دختر، مسز وجے لکشمی پنڈت"
قائدین بلحاظ قابلیت، سردار پٹیل"، "جواہر لال نہرو کے خیالات" ہیں۔ گاندھی جی کی
کتاب "فلوشپ آف فیتھس" کو آپ نے نہایت عرق ریزی سے ایڈٹ کیا ہے۔

۱۹۵۶ء اور ۱۹۵۸ء کے دوران آپ نے برہمو سماج مندر شملہ میں برہمو سماج اور
اس کا نصب العین، راجہ رام موہن رائے، اور دیگر عنوانات پر بیس لیکچرز دیئے۔

آپ کے فاضلانہ مقالے ہندوستان اور بیرون ہندوستان کے ممتاز رسالوں
اور علمی جرائد میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں۔ اور قدر کی نگاہوں سے
دیکھے جاتے ہیں۔ آپ کا مقالہ، سیکولرازم اور ہندوستانی سماج" بڑا دلچسپ اور
معلومات آفریں ہے۔ اسی طرح آپ کا مقالہ جس میں دوسرے مذاہب اور تہذیبوں
سے اسلام کا مقابلہ کیا گیا ہے خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اور اس بات کو ظاہر کرتا
ہے کہ آپ اسلام پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ آپ پر اہلِ ملک فخر کر سکتے ہیں۔

گمنام شاعر

آج سے ۳۰، ۳۱ سال پہلے کا واقعہ ہے ۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق اردو رسم الخط میں جزوی تبدیلیوں کے حق میں تھے اور اپنی قرار دادوں کو دہلی اور ناگ پور میں منظور کروا چکے تھے ۔ حیدر آباد کے جوبلی ہال میں اردو کانفرنس منعقد ہوئی تھی جس میں ان تحریکات کو منظور کروانا چاہتے تھے اس جلسہ میں سر عبدالقادر ایڈیٹر مخزن، رشید احمد صدیقی، سر تیج بہادر سپرو اور خواجہ حسن نظامی شریک تھے ۔ لیکن اس قرارداد کی مخالفت کی توفیق ہوئی متعلقہ ورنگل کے رہنے والے ایک برہمن زادہ مدرس کو، جس کی عمر اس وقت بہ مشکل ۳۸ سال کی ہوگی، اس نوجوان نے اردو رسم الخط میں تبدیلی کے خلاف ایک مقالہ سنایا ۔ جب آراء حاصل کی گئیں تو دامودر ذکی ٹھاکور کی تحریک منظور ہوئی ۔ لیکن دکن کا رہنے والا اردو کا یہ سپاہی گوشہ گمنامی میں رہا۔ شعر کہتا رہا اور اپنے ذخیروں کو گنواتا رہا۔ ذکی کے کلام کا غیر مطبوعہ مجموعہ پولیس ایکشن کے قبل تلنگانہ میں مقامی ہنگاموں میں محمد شریف "چپراسی تحصیل" کے مکان میں نذر آتش ہوگیا، جو خوشنویس تھے اور مجموعہ کلام کی نقل کر رہے تھے ——

بعد کا کلام بھی ۶ مئی ۱۹۶۰ء کو سفر کے دوران اسٹیشن ٹانڈور پر گم ہوگیا) یہ گمنام مشق سخن کرتا رہا۔ اسے خوب سے خوب ترکی تلاش تھی۔ ۵۰ سال بعد ۱۹۶۶ء میں جب ان کا پہلا مجموعہ کلام "سفینۂ ذکی" کے نام سے شائع ہوا تو مولانا عبدالماجد دریابادی کو یہ کہنا پڑا کہ "دکن کے ایک دیہات کے باشندے نے خدا جانے ایسی زبان کہاں سے سیکھ لی"۔ ذکی نے زبان ہی نہیں سیکھی بلکہ اس کا مزاج بھی سیکھا اس تہذیب کو بھی اپنایا جس کا ورثہ اردو زبان ہے۔ یہ سب یوں ہی نہیں ہوگیا۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کیا جانیں کہ اس کے پیچھے کتنی ریاضت ہے۔

نہیں کھیل اے داغ یاروں سے کہدو
کہ آتی ہے اردو زباں آتے آتے

:امودر ذکی ۲۰ر اپریل ۱۹۰۳ء کو بمقام کوڑنگل ضلع گلبرگہ پیدا ہوئے۔ کوڑنگل آج کل ضلع نگر (آندھرا پردیش) کے متعلقہ کا مستقر ہے۔ آپ کے اجداد دیسکھ تھے اور ضلع رتناگری کے موضع پڑیل کے رہنے والے تھے۔ دیسکھی برخاست ہوئی تو آپ کے والد شیورام پنت اور چچا باجی راؤ اندور، گوالیار، جھانسی وغیرہ ہوتے ہوئے تلاش معاش میں حیدرآباد آئے۔ ریاست حیدرآباد نے اپنے روایاتی انداز پر ان خاندانی اصحاب کو آسرا دیا۔ سررشتہ بندوبست میں جائداد گرداوری پر ان کا تقرر ہوا۔ آپ کے چچا کوڑنگل، اور والد چنچولی میں متعین کیے گئے۔ چنچولی کی آب وہوا موافق نہ ہونے سے آپ کی والدہ اور بڑے بھائی کو کوڑنگل بھیج دیا گیا۔ اس وقت تک ذکی پیدا نہیں ہوئے تھے

۱۹۰۸ء میں جب کہ ذکی صرف ۵ سال کے تھے آپ کے والد ماجد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ آپ کی تعلیم و تربیت آپ کے چچا کی نگرانی میں کوڑنگل ہی میں ہوئی۔

ابھی ذکی پانچویں جماعت کے طالب علم ہی تھے کہ مولوی اسماعیل شریف ازل کے تلامذہ میں شامل ہو گئے اور تقریباً دو سال تک فن عروض سیکھتے رہے اس کے بعد حبیب اللہ وفا نبیرۂ حبیب اللہ ذکا مدرس ہو کر کوڑنگل آئے تو ذکی نے حضرت وفا سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ اس سعادت مند شاگرد نے استاد کی خدمت کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ تقریباً دو سال تک آپ نے استاد کا کھانا اپنے ہاتھ سے پکایا اور اس طرح حق شاگردی ادا کیا۔ اور استاد نے بھی ۲ سال تک گوشت ترک کر کے اس برہمن نژاد شاگرد کو خدمت کا موقع دیا۔

ختم تعلیم کے بعد ذکی سررشتۂ تعلیمات سے منسلک ہو گئے اور دوران ملازمت حضرت وفا کے مشورے سے لاہور سے منشی فاضل کا امتحان کامیاب کیا۔ جب ملازمت کے سلسلہ میں ذکی کی تعیناتی کوہیر میں ہوئی تو اس وقت حضرت وفا بیدر میں تھے۔ ذکی ہر پنجشنبہ کو سائیکل پر ۲۴ میل کا سفر طے کر کے کوہیر سے بیدر جاتے اور اپنے استاد سے فیض حاصل کرتے۔ یہ سلسلہ تقریباً ۱۴ سال تک جاری رہا۔

یہ اردو کا اعجاز ہے کہ اس زبان میں ایسے ادیبوں اور شاعروں کی تعداد شمار سے فزوں تر ہے۔ جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے۔ جہاں ہم کو اکثر و بیشتر ملیالی شعراء ملیں گے۔ وہاں ایسے ہندوستانی بھی ملیں گے جنھوں نے مادری زبان ہندی، مرہٹی، کنڑی وغیرہ ہونے ہوئے بھی اردو شاعری میں نمایاں مقام حاصل

کیا ہے ۔ ذکی کا شمار بھی ایسے شعراء میں ہے ۔ ذکی نے اردو کو اس شان سے اپنایا ہے کہ اب ہمارے لئے یہ باور کرنا مشکل ہے ان کی مادری زبان ... مرہٹی ہے ۔

اپنے ایک خط میں ذکی مجھے لکھتے ہیں " میری زندگی میں کوئی اہم واقعہ نہیں ہوا " یہ ان کی انکساری ہے اور مجھے اس بیان کی صحت سے انکار ہے یہ کیا کم ہے کہ ان کی زندگی کی داستان اردو ادب میں شہ پاروں کی شکل میں بکھری پڑی ہے ۔ اس سے زیادہ کسی بھی شاعر کی زندگی میں اور ہوتا ہی کیا ہے ادب میں اپنا خاص مقام رکھنے والے اچھے اچھے اشعار جس کی زندگی کے اہم واقعات ہوں اس کی زندگی میں اور کیا چاہئے ۔

ذکی کے لب و لہجہ اور فکر و خیال سے ان کے کہنہ مشق ہونے کا ثبوت ملتا ہے ان کو زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے ان کو زبان پر نہ صرف استادانہ عبور ہے بلکہ ان کی طبع رسا کو جملہ اصناف سخن پر پورا پورا قابو حاصل ہے ۔ غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

مقصود غم سے شکوہ اہل جفا نہیں
ہر اشک بے بسی کے خلاف احتجاج ہے

عمر بھر کاوش زندگی چاہئے
اور تو کچھ نہیں آدمی چاہئے

میری توبہ کو بہانے جو برس کے تو کہوں
کیوں ہواؤں پہ دکھاوے کی گھٹا چھائی ہے

اشک سوکھیں تو شوق سے سوکھیں
فکر کیا ہے ابھی لہو تو ہے

جس نے دل کا جس انداز سے پوچھا تھا مزاج
اب وہی ہے تیرا اللہ ازہد اخیر کرے

رکا ہوا ہے دم واپسیں اک آس لئے
ہرج نہ ہو تو ادھر اک نگاہ کر لینا

ہم کو بھی تھا اپنی تہی دامنی کا غم   لیکن ہے آج فکر کہ داماں کا کیا ہوا

سلام کے لئے اٹھی نظر کہ پائی حیات   نظر جھکا کے اس انداز سے سلام لیا

ان کے سیدھے سادے کلام میں بلا کی تاثیر ہے فرماتے ہیں ۔

یہ اور بات ہے ہنستے گذار دی ہم نے   وگرنہ کب ستم روزگار ہو نہ سکا

اسے مرے پاؤں کے چھالو کرم اتنا تو کرو   کہیں مجروح کوئی خار نہ ہونے پائے

یہی حال نظم کا ہے ۔ ان کی نظم "بے بس بیکار" اپنا خاص انداز رکھتی ہے ہر شعر روانی ۔ سلاست ، زور بیاں اور مسائل حاضرہ پر تبصرہ اور طنز ہے ۔ ان کی ایک اور نظم "مہاتما گاندھی" ان کے جذبہ حب قومی کو ظاہر کرتی ہے ۔ رباعیات بھی زکی نے اچھی اچھی کہی ہیں ۔ ان کی رباعیوں کو پڑھ کر ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے ۔

کٹتی ہی چلی حیات بربادی میں
آثار ہیں ویرانی کے آبادی میں
زنداں میں ترس رہے تھے آزادی کو
جینے کو ترس رہے ہیں آزادی میں

کر یاد کہ ایسے ترے دن بیتے ہیں
کیا تیرا بگڑتا ہے جو ہم جیتے ہیں
ڈر تجھ سے ریاکار سے کیا ؟ اے زاہد
ہم پیتے ہیں ، ہم پیتے ہیں ، ہم پیتے ہیں

نعت گوئی میں بھی ذکی کا مقام بلند اور قابل قدر ہے۔ ان کے نعتیہ اشعار سے عقیدت و احترام کا پورا پورا اظہار ہوتا ہے۔ جب حضرت عبدالماجد دریابادی یہ فرماتے ہیں کہ "ایسے سرمست مداح نبی کو غیر مسلم کس زباں سے کہوں" تو ایک پہلو یہ نکلتا ہے کہ غیر مسلم مداح نبی نہیں ہو سکتا جو درست نہیں ہے اور یہیں ان کے نعتیہ کلام کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ چند نعتیہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

کیا قیامت تھی کہ دوزخ کا پتہ تک نہ رہا — در دوزخ پہ فقط نام لیا تھا تیرا

ترا در مل گیا سب کچھ ہیں ہے — اب آگے اور کیا ہے کچھ نہیں ہے

ہردم ترا تصور ہر دم خیال تیرا — جس زندگی کو ہوگا وہ زیست جاوداں ہے

تاریخ گوئی میں بھی ذکی کو مہارت حاصل ہے بعض بڑی اچھی تاریخیں ان کے ہاتھ آئی ہیں۔

مادۂ تاریخ رحلت فانی — ع — نشانی ہے کہ آ و قبر فانی دیکھنے جاؤ
۱۳۶۰ ہجری

مادۂ تاریخ رحلت آصف سابع

ہے ذکی یہ مصرعہ سال وفات — ہائے عثماں ہائے عثماں ہائے ہائے
۱۳۸۶ ہجری

مادۂ تاریخ انتخاب راشٹرپتی ع — صدر بھارت ہوا آج ذاکر حسین
۱۹۶۷ء

ذکی کی انفرادیت ہی ان کے کلام کی سب سے بڑی اور سب سے اہم خصوصیت ہے ان کا شعری ذوق اور اپنے فن سے انہاک اپنا خاص انداز رکھتا ہے اس انفرادیت کے متعلق ایک تحقیقی مقالہ بھی لکھا جاتے تو بات اتنی واضح نہ ہو گی جو خود ان کے شعر سے واضح ہے۔ دیکھئے ایک شعر میں خیالات کے ایک سمندر کو سمو دیا گیا ہے۔

ایک دن نقشِ قدم پر مرے بن جائے گی راہ
آج صحرا میں تو تنہا ہوں کہیں کوئی نہیں

سادگی روانی۔ سلاست بیاں۔ بے ساختگی، شگفتگی، الفاظ کے انتخاب میں خوش سلیقگی۔ ذکی کی انفرادیت کے اہم اجزا ہیں۔ شاعر کی انفرادیت اس کی شخصیت سے ہٹ کر کوئی چیز نہیں۔ ذکی کی انفرادیت کو بھی ان کے کلام کے علاوہ ان کی شخصیت میں ڈھونڈنا ہوگا۔ ان کی پاک سیرت، ان کی عاجزی وانکساری، ان کی وضع داری، ان کی انسان دوستی اور حق پرستی، ان کی شخصیت میں نمایاں ہیں اور یہ خصوصیات بقول ڈاکٹر غیاث الدین صدیقی ان کی غزل گوئی کے لئے بیحد سازگار ہیں۔ میں تو یہ کہوں گا کہ ان کے سنانے کا انداز بھی ان کی انفرادیت کا جزو ہے۔ اس لحاظ سے اردو کا انوکھا اور بے نظیر ادارہ مشاعرہ ہی شاعر کی انفرادیت کو پوری طرح سامنے لاسکتا ہے۔ مجموعہ کلام اس کا پورا بدل نہیں ہوسکتا۔ البتہ مشاعرہ حال تک یا صرف ہال تک محدود رہتا ہے۔ مجموعہ کلام زبان ومکاں کے حدود سے بڑھ کر مستقبل کے سخن فہموں کے لئے بھی ہے۔

ذکی کا شمار ایسے شاعروں میں ہے جن کے کلام کی اہمیت امتداد زمانہ سے کم نہیں ہوگی بلکہ اس میں اضافہ ہی ہوگا۔ ان کا کلام باقی رہے گا کیوں کہ اردو ادب میں اس کو ایک مستقل مقام حاصل ہے۔ میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے ان کے مجموعہ کلام "ارج" کی اشاعت کے سلسلہ میں جس کو اردو ادب کی ایک اہم خدمت قرار دیا جاسکتا ہے کچھ کرنے کی توفیق ہوئی[1] ان کا مجموعہ کلام "ارج" جس کو اردو کے عظیم

[1] جنوری ۱۹۸۱ء میں ڈسٹرکٹ ویلفیر کمیٹی محبوب نگر کی رقمی اعانت سے "ارج" کی اشاعت عمل میں آئی۔

خزانوں میں ایک بیش بہا اضافہ قرار دیا جاسکتا ہے اس مستقبل کی نشاندہی کرتا ہے جب ذکی کی زیادہ قدر کی جائے گی ۔

مبارک ہیں وہ ہستیاں جو اپنے فن کے ذریعہ خود زندہ جاوید بن کر اس زبان کا بھی بول بالا کرتی ہیں جس کو انھوں نے اپنے فن کے اظہار کے لئے انتخاب کیا ۔ ذکی کو افلاس اور گمنامی مبارک ہو جو اس عجیب وغریب دنیا میں اکثر و بیشتر بڑے فنکاروں کی قسمت رہی ہے ۔

امید کہ یہ کاغذ اور اس کے نقش جو زندگیوں سے زیادہ پائیدار ہوتے ہیں ذکی کو دوبارہ ڈھونڈ نکالنے میں مدد دیں گے ۔

فخرِ ہند

ایک لڑکا جس کی عمر لگ بھگ دس سال کی ہے الماری پر چڑھ کر چھت کو چھونے کی کوشش کرتا ہے۔ الماری الٹ جاتی ہے اور وہ الماری سمیت نیچے گرتا ہے۔ اس کے سر میں سخت چوٹ آتی ہے لیکن وہ دھن کا پکا ہے۔ عمر کے ساتھ ساتھ وہ چھت کی بلندیوں کی بجائے مدارج کی بلندیوں کو اپنا نصب العین بناتا ہے۔ الماری کی بجائے اصولوں اور کردار کا سہارا لیتا ہے اور ۲۴ راگست ۷۴ء کو مادی حیثیت سے وہ ایسی بلندی پر پہنچ جاتا ہے کہ دنیا بھر کے اربوں انسانوں کی توجہ کا مرکز بن جاتا ہے۔ اگر مادی حیثیت کو نظر انداز بھی کیا جائے تو اس نے ان بلندیوں کو پہلے ہی چھو لیا ہے جنھیں انسانیت کی معراج قرار دیا جا سکتا ہے۔

خدا کے قانون کے تحت ہر انسان اپنے عزائم تک پہنچ سکتا ہے البتہ اس کے لئے یقین اور عمل کے علاوہ خلوص اور انکساری کی ضرورت ہے۔ جناب فخرالدین علی احمد نے بچپن ہی سے اپنا نصب العین اونچا رکھا اور مندرجہ بالا خصوصیات کو حیرت انگیز طریقہ پر اپنی طبیعت کا جزو بنا لیا۔

گذشتہ پونے دو سال سے مجھے جناب احمد صاحب کی شخصیت کا قریبی مطالعہ کرنے کا موقع ملا میں نے سرکاری اور ادبی کاموں کے سلسلے میں ان سے بے شمار ملاقاتیں کیں۔ وہ مقناطیسی شخصیت کے مالک ہیں۔ اپنے نقطۂ نظر کو اثر سے نہیں تاثر سے منوانا جانتے ہیں۔ خدا نے جو بیش بہا خوبیاں ان کو ودیعت کی ہیں ان میں وہ مسکراہٹ بھی ہے جو بے شمار مصروفیات میں بھی ان کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔ وہ کم گو ہیں لیکن نہایت ورجہ معاملہ فہم ہیں۔ جلد بات کی تہ تک پہنچ جاتے ہیں وہ اہم فیصلے نہایت آسانی سے کرتے ہیں۔ انھیں خود اعتمادی حاصل ہے وہ ایسی نرم و نازک طبیعت رکھتے ہیں کہ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ "نہیں" کہنا نہیں جانتے لیکن واقعہ اس کے خلاف ہے۔ وہ "نہیں" بھی ایسے اخلاق، خلوص اور غیر جانب داری سے کہتے ہیں کہ مخاطب اس کو بطیب خاطر قبول کر لیتا ہے۔ عام طور پر کرسی نشین "نہیں" اس طور سے کہتے ہیں کہ اس میں غیر ضروری طور پر مخالفت اور مخاصمت کا پہلو نکل آتا ہے اور اہل معاملہ "نہیں" کے ناگوار اثر کو تو برداشت کر سکتے ہیں "نہیں" کے انداز کو برداشت نہیں کر سکتے۔ وہ ناراض ہونا نہیں جانتے یا یوں کہا جائے کہ ضبط کا وہ بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں کہ ناراضی کا اظہار نہیں ہونے پاتا۔ بڑے عالی ظرف ہیں۔ مخالفت کرنے والے کو معاف کرنے اور عفو و درگذر کرنے والا دل ... رکھتے ہیں۔

احمد صاحب کے بزرگ اورا اورنگ زیب کے زمانہ میں میر جملہ کے ساتھ آسام گئے اور وہاں آباد ہو گئے احمد صاحب کو صلاحیت ورثہ میں ملی۔ ان کے والد ذوالنور علی احمد پہلے ہندوستانی تھے جنھوں نے ۱۸۷۰ء میں انڈین میڈیکل سروس کا امتحان پاس کیا۔ اس زمانہ میں یہ بڑے اعزاز کی بات تھی زیڈ احمد صاحب کو اردو زیادہ

نہیں آتی تھی وہ سنسکرت سے واقف تھے۔ ۱۸۷۲ء میں ان کو شیوساگر ڈویژن کا سول سرجن مقرر کیا گیا۔ ان دنوں آسام میں انگریز پلانٹرز کا راج تھا چیف کمشنر کی ایک پارٹی میں امتیازی سلوک کرنے پر انہوں نے احتجاج کیا جس کے نتیجے کے طور پر ان کا تبادلہ فوج میں کر کے انھیں صوبہ سرحد بھیج دیا گیا۔

کرزن دربار سے قبل وہ دلی میں میڈیکل افسر تھے۔ یہیں انھوں نے رقیہ سلطان بیگم سے شادی کی جو نواب زین العابدین عارف کی پوتی تھیں (عارف مرزا غالب کی شریک حیات امراؤ بیگم کے حقیقی بھانجے تھے) ان کے ۵ لڑکے اور ۵ لڑکیاں ہوئیں۔ پہلے دریا گنج میں کرایہ کی کوٹھی لے کر رہتے تھے پھر گلی قاسم جان میں منتقل ہوئے وہاں آبائی مکان ضیا منزل (محل سرا) میں رہے اور پاس ہی ایک چھوٹا مکان کرایہ پر لیا جس کو انہوں نے اپنا مطب بنایا۔ ہندوستانی ہونے کی وجہ سے انھیں محکمہ صحت کا انسپکٹر جنرل نہیں بنایا گیا اور کوئی بات ان کے خلاف نہ تھی انھوں نے انگلستان تک بھی اپنی کارروائی میں نمائندگی کی لیکن نتیجہ برآمد نہ ہوا جس کی وجہ سے دل برداشتہ ہو کر تین برس قبل ہی انھوں نے استعفا دیدیا اور دلی میں نجی پریکٹس کرنے لگے۔

احمد صاحب نے بچپن ہی سے اپنے والد کے ساتھ کمشنر کی پارٹی میں امتیازی سلوک والد کی جانب سے احتجاج اور اس کی سزا کی تفصیلات سنی تھیں پھر ہندوستانی ہونے کے باعث انھیں جائز ترقی سے محروم رکھا گیا تھا۔ ان باتوں کا ان کی حساس طبیعت پر بڑا اثر ہوا آزادی کی تحریک میں احمد صاحب کی شمولیت میں اس اثر کا بھی قابل لحاظ حصہ رہا ہوگا۔

جناب فخرالدین علی احمد ۱۳ رمئی ۱۹۰۵ کو دہلی میں پیدا ہوئے وہ اپنے والد کے ہمراہ چار سال گونڈہ شہر میں رہے جہاں درجہ پنجم سے درجہ ہشتم تک تعلیم حاصل کی ان کا شمار شوقین

اور ہونہار طالب علموں میں ہوتا تھا سنجیدہ اور خاموش طبیعت تھے کھیل کود سے دلچسپی تھی۔ جب ان کے والد کا تبادلہ دہلی ہو گیا جہاں انھوں نے گورنمنٹ ہائی اسکول سے میٹرک کامیاب کیا پھر سینٹ اسٹیفنس کالج دہلی سے ایف اے کامیاب کیا۔ ان دنوں حکیم اجمل خاں صاحب کے خیالات اور جذبہ حب الوطنی سے احمد صاحب متاثر ہوئے۔ اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان گئے۔ ۱۹۲۷ء میں جامعہ کیمبرج سے مضمون تاریخ میں ٹرائی پاس کیا پھر قانون کا امتحان پاس کر کے انر ٹیمپل سے بیرسٹر ہو گئے۔ ۱۹۲۸ء میں بیرسٹری کا امتحان پاس کیا پنڈت نہرو سے پہلی ملاقات ۱۹۲۶ء میں کیمبرج کے قیام کے دوران ہوئی جب کہ پنڈت نہرو اپنی شریک حیات کملا نہرو کے ساتھ ان کے علاج کے لئے انگلستان آئے تھے اس ملاقات سے ان کو اپنی زندگی کا لائحہ عمل مرتب کرنے میں مدد ملی۔ محمد علی جناح سے بھی ان کی پہلی ملاقات اسی دوران ہوئی۔ محمد علی جناح کے جذبہ قوم پرستی سے بھی وہ متاثر ہوئے۔

دورانِ قیام لندن ہی میں ان کے والد کی خواہش تھی کہ وہ آئی سی ایس کے مقابلہ میں حصہ لیں لیکن احمد صاحب کا رجحان آئی سی ایس کا نہ تھا ان کے سر میں کچھ اور ہی دھن تھی وہ تحریک آزادی سے متاثر تھے وہ سر محمد شفیع کے ساتھ پنجاب میں قانونی پریکٹس کرنا چاہتے تھے لیکن چوں کہ ان کے والد کی جائداد آسام میں تھی اور جائداد کے تعلق سے کچھ مقدمات زیر دوران تھے اس لئے انھیں آسام جانا پڑا۔ جہاں انھوں نے اپنی جائداد کے مقدمات کی دیکھ بھال کے ساتھ ساتھ کلکتہ اور گوہاٹی ہائی کورٹ میں پریکٹس شروع کر دی۔ ایک زمانے میں ان کی بہت اچھی پریکٹس تھی۔

احمد صاحب ۱۹۳۱ء میں یعنی انگلستان سے واپسی کے بعد ہی انڈین نیشنل کانگریس

کے رکن بنے۔ لیکن سیاسی زندگی کا آغاز ۱۹۳۵ء کے انڈیا ایکٹ کے نفاذ کے بعد ہوا۔ اسی سال انھوں نے سر محمد سعد اللہ کے نمائندے کے مقابلہ میں اسمبلی کا الیکشن جیتا جو اس وقت ریاست میں برسرِ اقتدار تھے ۱۹۳۷ سے ۱۹۴۵ تک کانگریس کے ٹکٹ پر آسام کی مجلس مقننہ کے رکن رہے انھوں نے آزادی قبل آسام میں مسلم لیگ کی سختی سے مخالفت کی۔ انھوں نے ہمیشہ فرقہ پرستی کے خلاف جنگ کی۔ مسلم لیگ کی فرقہ وارانہ سیاست اپنے دورِ شباب میں بھی ان کو متاثر نہ کرسکی۔ اور وہ عزم و استقلال کے ساتھ اس کی رجعت پسندانہ پالیسیوں کی مخالفت پر ہر وقت کمربستہ رہے۔ انھوں نے اس وقت کانگریس اور اس کے اصولوں کا علم بلند رکھا جب کسی مسلمان کے لئے کانگریس کا نام لینا اور اس کے لئے کام کرنا اپنے لئے خطرات مول لینا تھا۔ اور اپنی شہرت وعزت کی بازی لگانا تھا۔ لیکن انھوں نے اپنے اصولوں کی خاطر کس بات کی مطلق پروا نہ کی۔ اس حیثیت سے اپنی ریاست میں ان کی واحد اور منفرد شخصیت تھی۔ ع

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
لوگ آتے ہی گئے اور کارواں بنتا گیا

۳۹-۱۹۳۸ء میں مسٹر گوپی ناتھ باردولی نے آسام میں وزارت تشکیل دی تو احمد صاحب کو وزیرِ مالیات بنایا گیا۔ ۱۹۴۰ء میں انھوں نے گوپی ناتھ باردولی کے ساتھ استعفیٰ دے دیا۔ اور انفرادی ستیہ گرہ میں حصہ لیا۔ ان کو ایک برس کی سزائے قید ہوتی جیل سے چھوٹے ہی تھے کہ گاندھی جی نے "کرو یا مرو" تحریک شروع کی تو انھوں نے اس تحریک میں حصہ لیا۔ پورے آسام میں وہ پہلے شخص تھے جنھیں اس تحریک کے تحت گرفتار کیا گیا۔ گرفتاری کے وقت وہ سخت بخار میں مبتلا تھے اس مرتبہ ساڑھے تین سال جیل میں رہے اور اپریل ۱۹۴۵ء میں انکی

رہائی ہوئی رہائی کے بعد انھیں دوبارہ آسام کا وزیر مالیات بنا دیا گیا۔ ۱۹۴۵ء کے الیکشن میں دوسری مرتبہ ان کو مسلم لیگ کا مقابلہ کرنا پڑا۔ خود محمد علی جناح نے ان کے خلاف الیکشن کی مہم میں حصہ لیا۔ (جو اس وقت تک قومی تحریک سے اپنا ناطہ توڑ چکے تھے اور مسلم لیگ کے قائد بن چکے تھے) اس مرتبہ احمد صاحب مسلم لیگ کے امیدوار کے مقابلہ میں ناکام رہے۔

جب ۱۹۴۶ء میں ہندوستان کے لئے عارضی حکومت کی تشکیل دی جا رہی تھی تو وزارت کے لئے جن مسلمانوں کے نام لئے جا رہے تھے۔ ان میں آپ کا نام بھی تھا (اخبار اسٹیسمین مورخہ ۳۰ راگست ۱۹۴۶ء) ۱۹۴۶-۴۷ء کے دوران ان کو کانگریس ورکنگ کمیٹی کا رکن بنایا گیا۔ ۱۹۴۶ء میں ان کو آسام کا ایڈوکیٹ جنرل بنایا گیا۔

۱۹۵۲-۵۳ء میں وہ راجیہ سبھا کے رکن نامزد ہوتے ۱۹۵۷ء تک بھی وہ راجیہ سبھا کے رکن رہے ۱۹۵۵ میں ان کو ہندوستانی وکلا کے وفد کے صدر کی حیثیت سے روس بھیجا گیا ۱۹۵۷ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں ہندوستانی مندوب کی حیثیت سے شرکت کی۔

۱۹۵۷ء سے ۱۹۶۲ء تک کانگریس کے ٹکٹ پر دوبارہ ان کا انتخاب آسام کی مجلس مقننہ کے لئے ہوا۔ ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۶ء تک ریاست آسام کے وزیر مالیات قانون کمیونٹی قانون ڈولپمنٹ اور پنچایت راج رہے اس دوران یعنی ۱۹۶۴ء میں انھیں کانگریس ورکنگ کمیٹی اور آل انڈیا پارلیمنٹری بورڈ کا رکن بنایا گیا۔ اور اس وقت سے برابر وہ دونوں کے رکن رہے۔

۲۹ رجنوری ۱۹۶۶ء کو وزیر آبپاشی و برقی حکومت ہند مقرر ہوئے ۱۹۶۶ء میں تعلیمات کا قلمدان وزارت ان کے تفویض ہوا۔ ۱۹۶۷ء کے عام انتخابات میں بارپیٹہ (آسام) کے حلقہ انتخاب سے رکن پارلیمنٹ (لوک سبھا) چنے گئے۔

۱۹۶۷ء سے ۱۹۷۰ء کے دوران وزیر صنعتی و برقی و امور حکومت ہند رہے۔ اس وقت اوقاف کا کام بھی آپ سے متعلق ہوا۔

۷۰-۱۹۶۹ء کے دوران ملکی تجارت کا اور ۲۷ رجون ۱۹۷۰ء سے وزارت زراعت و اغذیہ کا قلمدان وزارت سنبھالا۔

جب کانگریس میں اندرونی اختلاف رونما ہوا تو احمد صاحب مرکزی قائدین میں پہلے تھے جس نے وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کا ساتھ دیا۔

احمد صاحب کی شادی ۱۹۴۵ء میں قید فرنگ سے رہائی کے بعد ہوئی۔ آپ کی شریک حیات اردو کے نامور افسانہ نگار سلطان حیدر جوش کی صاحبزادی ہیں اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی گریجویٹ ہیں۔ انھیں آرٹ۔ فنون لطیفہ کے کم و بیش تمام شعبوں اور شعر و ادب سے گہری دلچسپی ہے پینٹنگ ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ غالب صدی کے دوراں انھوں نے بہت سے اشعار کا عکس کٹ ورک میں پیش کیا تھا۔ جو تمام تر ان کے تخیل کی پرواز تھی۔ محترمہ عابدہ احمد کی سماجی اور تہذیبی سرگرمیوں کا مرکز آسام رہا۔ وہ آسام فلڈ ریلیف کمیٹی کی چیرمین رہ چکی ہیں۔

احمد صاحب کے ایک لڑکی اور دو لڑکے ہیں۔

احمد صاحب جتنے نرم گفتار۔ شیریں مقال اور با مروت ہیں اصول اور عزائم کے بارے میں اتنے ہی سخت واقع ہوتے ہیں ان کی ذات جدید و قدیم کا حسین امتزاج ہے۔ بلاشبہ احمد صاحب کا مقام ان لوگوں میں ہے جو ملک کی آزادی سے قبل بھی رہنماؤں کی صف اول میں رہے۔ انکا شمار ان حوصلہ مند اور اصول پرست چوٹی کے قائدین میں کیا جا سکتا ہے جو ہندوستان کے روشن مستقبل پر پورا یقین رکھتے ہیں اور جو ملک کے مفاد میں کسی بھی مخالفت

کا چٹان کی طرح جم کر مقابلہ کر سکتے ہیں ۔

احمد صاحب کو ادب سے بے حد لگاؤ ہے ۔ غالب صدی کی کامیابی تمام تر ان کی رہین منت ہے ۔ انھوں نے غالب صدی منا کر تمام دنیا میں اردو کا بول بالا کیا اور اہل اردو کو ایوان غالب جیسا خوبصورت تحفہ دیا ۔ غالب نے عارف کے ساتھ جو حسن سلوک کیا تھا عارف کی اولاد میں آپ نے تقاریب کی شکل میں اس کا پورا بدلہ چکا دیا ۔ امیر خسرو کی سات سو سالہ جشن کی کامیاب بنیاد رکھنے میں بھی آپ کی دلچسپی اور رہنمائی کو بڑا دخل ہے ۔

اگر مجھے احمد کے کردار کا قریبی مطالعہ کرنے کا موقع نہ ملتا تو میں احمد صاحب کو بڑا خوش نصیب آدمی سمجھتا کہ انھیں ایک عظیم ملک کے سربراہ ہونے کا موقع ملا لیکن اب میں سمجھتا ہوں کہ ہمارا ملک بڑا خوش نصیب ہے جسے فخرالدین علی احمد جیسا راشٹرپتی ملا ۔

(بشکریہ " آجکل ")

بہزاد دکن

نام اس لئے ہوتے ہیں، کہ انسان پہچانے جائیں۔ چوں کہ یہ پیدائش کے وقت دیئے جاتے ہیں۔ ان میں خاندانی عادات وخصائل کا اشارہ تو کیا جاسکتا ہے لیکن کسی فرد کی ذاتی عادات واکتسابی خصوصیات کا ذکر ممکن نہیں۔ خطاب جو بادشاہ یا حکومت کی جانب سے دیئے جاتے ہیں ان سے انسان جو دنیوی حیثیت حاصل کرتا ہے اس کا پتہ چل سکتا ہے۔ یہ کسی انسان کے لئے باعث افتخار ہوتے ہیں اور ہم چشموں میں عزت کا موجب بعض القاب عوام کے دیئے ہوئے ہوتے ہیں مثلاً قائد ملت، بابائے اردو وغیرہ ان کو شاہوں کے خطابات سے بڑا اعزاز سمجھا جاسکتا ہے کیونکہ عوام کی بارگاہ سے عطا ہوتے ہیں لیکن جو بادشاہ دلوں پر حکومت کرتے ہیں اور جن کی حکومت زمان ومکان سے ماوری ہوتی ہے وہ بھی خطابات عطا کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے خطابات موقتی سیاست کے ماتحت نہیں ہوتے بلکہ ان کی اہمیت دوامی ہوتی ہے۔ خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو ایسے اعزاز پاتے ہیں اور ایسے خطابات سے نوازے جاتے ہیں اردو نثر کے بادشاہ مصور فطرت، صوفی، دانا وبینا، بزرگ طریقت خواجہ حسن نظامی نے اپنے ایک عقیدت کیش کو "بہزاد دکن" کا خطاب عطا فرمایا تو اس خطاب میں اس انتساب کا بھی ذکر فرمادیا

جو اس وقت تک کیا گیا تھا اور اپنے خطاب کو ان سعادتوں کا پیش خیمہ بھی قرار دیا جو اس خوش نصیب عقیدت مند کو حاصل ہونا مقدر تھا۔ لیکن قدرت نے اپنے مقررہ نظام کے تحت ان باتوں کو عام نظروں سے اوجھل رکھا تھا اور جوش و عمل کی دنیا میں یقین محکم اور سعی پیہم کے رہین منت تھے۔

کس قلم میں طاقت ہے جو خواجہ صاحب کی قدردانی کا ذکر، ان سے بہتر انداز میں پیش کر سکے وہ فرماتے ہیں۔

فیاض الدین نظامی حیدرآباد کے شہرۂ آفاق اہل کا ذخواجہ صاحب نے فن کار کے معنوں میں استعمال فرمایا ہے) ہیں تمام دنیا خاص کر اسلامی دنیا کے طرز تعمیر کی سمجھ اور واقفیت جتنی ان میں ہے شاید کسی میں نہ ہوگی اور اگر ہوگی تو وہ اس سمجھ سے اور واقفیت سے کام لینا نہ جانتا ہوگا۔ ان کی تجویز کے نقشوں کے مکان منہ سے بولتی ہوئی غزل بن جاتے ہیں۔ دور سے دیکھو تو آنکھیں کہتی ہیں ہم کو برابر دیکھنے دو نظر یہاں سے نہ ہٹاؤ۔ مکان کے اندر جائیں تو ہوا اور روشنی اور گنجائش اور زیبائش قدم قدم پر دکھائی دے گی ان کی شہرت حیدرآباد سے بھوپال بھاولپور اور اودے پور تک پہنچی ہے اور مذکورہ ریاستوں نے حیدرآبادی حکومت سے درخواست کر کے اپنے ہاں بلاکر اپنی ریاستوں کے شہروں اور عمارتوں کی تعمیرات کے نقشے ان سے بنوائے ہیں۔ میں نے ان کو "بہزاد دکن" کا خطاب دیا ہے۔

(منادی ۱۶ر اکتوبر ۱۹۴۷ء)

اگر غور سے دیکھا جائے تو جناب فیاض الدین نظامی کی زندگی، فنی جدوجہد، شاندار کامیابیاں اور قابل رشک سعادتیں، اسی خطاب کی تفسیر دکھائی دیتی ہیں۔ اس مختصر خاکہ میں اس تفسیر کو اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

جناب فیاض الدین نظامی حیدرآباد کے متوسط درجہ کے گھرانے میں پیدا ہوئے یہ مفتیوں اور مولویوں کا خاندان تھا۔ ابتدائی تعلیم سٹی ہائی اسکول پھر سٹی کالج میں ہوئی۔ آپ کو بچپن سے فن نقشہ کشی سے خاص دلچسپی رہی بمبئی اور مدراس کے متعدد اسناد درجہ اول میں حاصل کئے۔ مسٹر ٹیشن کے خاص شاگردوں میں آپکا شمار رہا آپکو عربی زبان سے بھی دلچسپی رہی۔ قاری نذیر حسین شریف سے قرأت کی تعلیم حاصل کی۔ اور عربی میں مولوی عبدالمقتدر صاحب کی شاگردی کا شرف حاصل رہا۔

بچپن میں والدین کے انتقال کی وجہ سے انٹرمیڈیٹ کے بعد تعلیم کو خیرباد کہنا پڑا شفیق استاد سید محمد اعظم صاحب نے، جو اس وقت سٹی کالج کے پرنسپل تھے اسکول کے اسٹاف میں تقرر فرمادیا۔ دو سال بعد نواب ناظر یار جنگ رکن عدالت العالیہ کی سفارش پر نواب سر نظامت جنگ نے جو سٹی امپرومنٹ بورڈ کے صدر نشین تھے بورڈ کے دفتر میں تقرر کرکے آرکیٹیکچر کی اعلیٰ تعلیم کے لئے بمبئی بھجوایا جہاں جے جے اسکول آف آرکیٹکچر میں چار سال متعلم رہے۔ اس وقت ہندوستان میں اس فن کا یہ واحد ادارہ تھا پروفیسر بیاٹلی کی سفارش پر جو اسکول کے ڈائرکٹر تھے۔ حکومت... حیدرآباد نے ۱۹۳۰ء میں تعلیمی وظیفہ دے کر انگلستان بھیجدیا۔ جہاں آپ نے اے اے اسکول آف آرکیٹکچر میں داخلہ لے کر تین برس میں ڈپلوما حاصل کیا۔ ۱۹۳۴ء میں آپ کو رائل انسٹی ٹیوٹ آف برٹش آرکیٹکٹس کا رکن مقرر کیا گیا۔ آپ کا مقالہ جامعہ

عثمانیہ کی عمارتوں پر تھا تعلیم ختم کرنے کے بعد سر باورڈ رابرٹس کے مشورہ پر آپ نے اسپین اٹلی اور فرانس کا دورہ کیا وہاں کی عمارتوں اور طرز تعمیر کا گہرا مطالعہ کیا اسپین میں قصر الحمرا کا بخوبی مطالعہ کرنے اور اس کے نقشے مرتب کرنے کا موقع مل گیا جب ان کو اسکول کی نمائش میں رکھا گیا تو آپ کو اسکول کا "ستارہ،، عطا کیا گیا جو سب سے زیادہ پسندیدہ کام پر دیا جاتا تھا۔ جب سر اکبر حیدری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے لندن گئے اور ان نقشوں کو دیکھا تو اظہار خوشنودی کر کے آپ کو سرکاری مصارف پر بلجیم بھجوایا تاکہ وہاں مسٹر ارنسٹ جیاسپر (جو جامعہ عثمانیہ کے عمارتوں کے نقشے تیار کر رہے تھے) کے کام کو دیکھ کر سر اکبر حیدری کو اس کی رپورٹ پیش کریں۔ آپ کی رپورٹ سے، جو لکچر ہال کو آوازوں کی گونج سے محفوظ رکھنے سے متعلق تھی، سر اکبر حیدری نے اتفاق فرمایا۔ ۱۹۲۴ء میں حیدرآباد واپس ہونے پر آپ کو نواب علی نواز جنگ کے حکم سے نواب زین یار جنگ کے دفتر میں متعین کیا گیا جو چیف آرکیٹکٹ کی حیثیت سے جامعہ عثمانیہ کی عمارتوں کی تعمیر کے ذمہ دار تھے۔

یہاں ایک سال کام کرنے کے بعد نواب اعظم جنگ کے مشورہ سے آپ کو . . . (سیلف گورنمنٹ) حکومت مقامی کے محکمہ میں ٹاون پلاننگ افسر کی خدمت پر مامور کیا گیا جہاں جناب احمد مرزا اسپیشل انجینئر تھے یہاں آپ کو ماسٹر پلان مرتب کرنے کا زرین موقع ملا۔ سر رچرڈ کرافٹن سر تھیوڈور ٹاسکر اور سر ویلفرڈ گرگسن نے آپ کے کام کی قدر کی اور رفتہ رفتہ ٹاون پلانر اور چیف ٹاون پلانر کے عہدوں پر ترقی دی۔ سر ویلفرڈ گرگسن کی ایما پر آپ نے شہر حیدرآباد و سکندرآباد کا ماسٹر پلان تیار کیا جس کو حکومت نے منظور کر کے اسے عملی جامہ پہنانے کے لئے ایک مخصوص

کمیٹی تشکیل دی۔ پولیس ایکشن کی وجہ سے ان سفارشات کو روبہ عمل نہ لایا جاسکا۔

فن اپنی نزاکتوں اور خوبیوں کے باوجود خود کا اعتراف کروانے بڑی حد تک فنکار کی عملی صلاحیتوں کا محتاج ہوتا ہے۔ اکثر و بیشتر فن کار فنی بلندیوں کے باوجود عملی صلاحیتوں کے فقدان کی وجہ سے اپنے فن کی عظمت کو مکمل طور پر منوانے میں ناکام رہتے ہیں۔ شاعر اور خطاط کیلئے اپنی تخلیقات کو عالم وجود میں لانا زیادہ مشکل نہیں ہوتا انکے اعتراف کا انتظار کرنیکی ضرورت نہیں عالم وجود میں آجانے کے بعد قدر دان کبھی نہ کبھی پیدا ہوسکتے ہیں اور ہوتے ہی ہیں۔ البتہ آرکیٹکٹ کو اپنے فن کے اظہار کے لئے شاہجہاں کی تلاش کرنی پڑتی ہے جس عمارت کو عالم وجود میں آنے سے قبل اس کا ذہن تصور VISUALISE کرلیتا ہے اس کو فن کی نزاکتوں کے ساتھ تو نہیں دکیوں کہ یہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں لیکن ظاہری خوبیوں اور حسن کے ساتھ وقت کے شاہجہانوں تک پہنچانا ضروری بلکہ ناگزیر ہوتا ہے۔ یہ اس کا اپنا فرض ہوجاتا ہے۔ فن کار کے لئے جو اکثر و بیشتر حساس ہوتے ہیں یہ بڑا کٹھن کام ہے لیکن اپنے فن کی عظمت کا جتنا احساس ہوگا اتنا ہی اس دشوار گذار کام کو کر گذرنا پڑے گا۔ اگر وہ ایسا نہ کرسکے تو پھر اس کی تخلیق عالم وجود میں کیسے آئے گی۔؟ جناب فیاض الدین نظامی طبیعت کی انکساری کے باوجود یہ صلاحیت رکھتے ہیں کہ اپنے فن کو منوائیں اور اپنے تخیل کو ظاہری حیثیت دلائیں۔

دوران ملازمت نواب حمید اللہ خاں نواب صاحب بھوپال کی ایما پر جو چیمبر آف پرنسز کے صدر بھی تھے، آپ کو اس ادارہ میں شہری تشکیل کا مشیر مقرر کیا گیا تھا۔ سر رچرڈ کرافٹن کی خواہش پر، جو بھاولپور کے صدر اعظم بن گئے تھے، آپ نے وہاں کے دارالخلافہ بغدادالجدید کے نقشے تیار کئے جس پر ہز مائی نس صادق

محمد عباسی نواب صاحب بہاولپور نے بطور اظہار خوشنودی تمغہ رفیق عباسیہ معہ خطاب وسند خصوصی عطا فرمایا۔ زمانہ ملازمت میں مختلف حکومتوں اور اداروں کی خواہش پر حکومت حیدرآباد۔ عمارتوں اور صدر خاکوں کی تیاری کی اجازت دیتی رہی چنانچہ اسٹیٹ بنک آف حیدرآباد۔ رویندرا بھارتی گاندھی بھون نظامس آرتھوپیڈک ہسپتال۔ عثمان شاہی ملز۔ اعظم جاہی ملز اور زنانہ شوگر فیکٹری کی عمارتوں اور صدر خاکوں کے نقشے مرتب کئے۔ حیدرآباد سے باہر مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ کے نقشے مرتب کرنے کا موقع ملا۔ اس کا افتتاح پنڈت جواہر لال نہرو کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ مولانا آزاد لائبریری کے لئے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے اسلامی اور نئے طرز تعمیر کے امتزاج کی خواہش کی جس کو آپ نے بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ اور بوقت افتتاح جواہر لال جی نے بے حد پسند فرمایا اپنی تقریر میں پنڈت جی نے اس عمارت کے طرز تعمیر کو سراہتے ہوئے فرمایا کاش دہلی میں بھی ایسی عمارتیں زیادہ سے زیادہ تعمیر ہوں، یہ بھی فرمایا کہ مجھے موجودہ طرز کی ڈبوں جیسی عمارتیں ناپسند ہیں۔ چنانچہ انڈین اسٹانڈرڈ انسٹی ٹیوشن کے لئے خود پنڈت جی نے آپ کو نامزد کیا جس کے صدر نشین لال بہادر شاستری تھے۔ اس عمارت کا افتتاح بھی پنڈت جی نے کیا۔

حکومت ہند نے ڈاکٹر ہمایوں کبیر کی سفارش پر آپ کو آل انڈیا بورڈ آف ٹیکنیکل ... اسٹڈیز کا صدر نشین مقرر کیا۔ ۸ برس آپ صدر نشین رہے اور متعدد مدارس برائے ٹاؤن پلاننگ و آرکیٹکچر ملک کی ہر ریاست میں قائم کئے جن میں دہلی کا سکول آف پلاننگ اور آرکیٹکچر اور حیدرآباد کا کالج آف آرکیٹکچر ــــــــــــــ

قابل ذکر ہیں۔ اسی دور میں آپ کی اور مسٹر ایل۔ این گپتا کی کوششوں سے حیدرآباد کالج کو مسلّمہ قرار دیا گیا آپ کو دہلی اسکول آف پلاننگ کا فیلو اور صدر منتخب کیا گیا۔ آپ نے پانچ برس بحیثیت صدر خدمات انجام دیں۔

حکومت پاکستان نے بھی آپ کی خدمات حاصل کرنے کی بے حد کوشش کی لیکن یہاں کے کاموں کی اہمیت کے پیش نظر آپ کو صرف چند ہفتوں کے لئے کراچی جانے اور کام کرنے کی اجازت دی گئی۔ اس طرح ۱۹۵۲ء میں ادارہ اقوام متحدہ بھی حکومت ہند اور حکومت حیدرآباد سے آپ کی خدمات حاصل کرنا چاہتا تھا لیکن نواب مہدی نواز جنگ نے، جو اس وقت وزیر امکنہ تھے اس بنا پر کہ ان دنوں اہم اسکیمات کو روبہ عمل لایا جا رہا تھا، اس سے اتفاق نہیں کیا۔

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب ہمیشہ آپ کے فن کے قدر داں رہے اور جامعہ ملیہ کی مسجد کے نقشے مرتب کرنے کے کا کام آپ کو تفویض کیا یہ مسجد زیر تعمیر ہے اور انشاء اللہ اس کا شمار دہلی کی بہترین مسجدوں میں ہوگا۔ ذاکر صاحب ہی نے مسز اندرا گاندھی سے سفارش کر کے صد سالہ تقاریب کے موقع پر غالب میموریل کے نقشے تیار کروالئے۔ اس کا نصف حصہ لائبریری اور میوزیم پر مشتمل ہے اس کا افتتاح دو سال قبل محترمہ اندرا گاندھی نے کیا، اسکیم کا دوسرا نصف حصہ آڈی ٹوریم ہے جو قریب الختم ہے۔

باشی

انھیں خاندان کے سب چھوٹے بڑے پیار اور عقیدت سے باشی کہہ کر پکارتے تھے۔ بڑی ملنسار اور دلکش شخصیت کی مالک تھیں۔ دردمند اور ہمدرد دل پایا تھا۔ شادی بیاہ یا دوسری تقاریب میں خصوصاً غریب رشتہ داروں کے ہاں ضرور شرکت کرتیں اور دل کھول کر خرچ کرتیں۔ بڑی وضعدار خاتون تھیں۔ داد و دہش فطرت میں تھی۔ ہر ایک کے دکھ درد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتیں۔ خلوص اور محبت کا پیکر تھیں۔ ہر رشتہ دار یہی سمجھتا کہ باشی اسے سب سے زیادہ چاہتی ہیں۔ لیکن باشی کا ایک وسیع تر خاندان بھی تھا۔ وہ شاعرہ تھیں۔ فطرت اور کائنات سے ناطہ جوڑے ہوئے تھیں۔ ع مری حیات تو وابستہ کائنات سے ہے۔ ان کے اطراف جو لوگ رہتے ان کو باشی کی اندرونی دنیا ان کے جذبات اور خیالات کا پتہ نہ تھا۔ وہ کچھ کہہ دیتیں تو وہ سنتے اور پسند کرتے وہ جانتے تھے کہ باشی شاعرہ ہیں اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں جانتے تھے۔ باشی کے احساسات سے وہ سب ناواقف تھے۔ باشی اس حیثیت سے اکیلی تھیں کھوئی کھوئی سی کیفیت جو ہر شاعر کا سرمایہ حیات ہوتی ہے۔ باشی پر ہمیشہ مسلط رہی خود لکھتی ہیں "میرا یہی جذبہ تاثر جو ایک کھوئی ہوئی کیفیت کے ساتھ میرے تصورات میں ہجوم تفکر کے طوفان بپا کرتا ہے میرے ہوش سنبھالنے کے پہلے سے میری سرشت میں موجود تھا ......

عمر کے ساتھ ساتھ مشاہدوں اور تجربوں کے سائے میں اس کی نشو ونما ہوئی اور اب زندگی، اس کا ساتھ دیتی ہوئی آرہی ہے اور میں زندگی کا"، ایک جگہ کہتی ہیں۔

مگر ہے اصل حقیقت کہ پابہ گل ہوں میں

رہین شعر نہیں راز دار دل ہوں میں!

بشیر النساء بیگم کے والد سید عبدالرحمٰن صاحب پنجاب کے ملک خاندان کے چشم وچراغ تھے حصول ملازمت کے سلسلہ میں ترک وطن کر کے حیدرآباد آئے محکمہ سیاسیات میں مددگار تھے۔ اپنی ایک نظم "یاد ش بخیر" جو والد مرحوم کی تصویر دیکھ کر لکھی گئی فرماتی ہیں۔

تجھ سے مری نگاہ کو ذوق نظر ملا

تیرے کمال ہی سے جمال ہنر ملا

تیری شعاعیں جذب ہیں میری حیات میں

تیرے تاثرات ہیں ضم میری ذات میں

والدہ شمس النساء بیگم مرزا صادق علی بیگ مرحوم تعلقدار کی بھانجی تھیں۔ جن کی پرورش مرزا صاحب نے خود کی تھی۔ ان کا شمار اس وقت کی پڑھی لکھی بیدار مغز خواتین میں ہوتا تھا فن خطابت میں اعلیٰ معیار رکھتی تھیں زنانہ محفلوں میں اپنے وعظ کی وجہ سے مشہور تھیں خوش نویسی میں بھی اچھا مقام رکھتی تھیں اور شمس رقم کہلاتی تھیں ان کی وفات پر اپنی طویل نظم "ورق غم" ہے جس سے سنہ رحلت ۱۳۴۶ ہجری برآمد ہوتا ہے فرماتی ہیں

صفحۂ ہستی پہ وہ جو خلق کی تصویر تھی

آیۂ تعلیم نسواں کی جو اک تفسیر تھی

محفل نسواں میں جس کی ہر صدا انگیز تھی
جس کی ہستی بزم اعلیٰ میں بھی باتوقیر تھی
آہ اب وہ شمس نسواں ظلمت تربت میں ہے
روح تاباں اس کی حق کے دامن رحمت میں ہے

بشیر النساء بیگم ۲۱ر جنوری ۱۹۱۵ء کو حیدر آباد میں پیدا ہوئیں چھ بہنوں اور دو بھائیوں میں سب سے چھوٹی تھیں۔ ان کی تعلیم اس وقت کی روایات کے پیش نظر گھر ہی پر ہوئی اردو اور فارسی کے مستند شاعروں کے کلام سے اوائل عمری میں روشناس کروایا گیا۔ کم عمری ہی سے شاعری کی ابتدا کی لیکن ۱۹۲۷ء سے ان کی شعر گوئی کا آغاز ہوا۔

بشیر النساء بیگم کی بڑی ہمشیر اکرام علی صاحب صفوی معتمد اسٹیٹ خانخاناں کے بڑے صاحبزادہ مرزا لیاقت علی صاحب صفوی سے بیاہی گئی تھیں۔ سید عبد الرحمن صاحب نے اپنی سب سے چھوٹی لڑکی بشیر النساء بیگم کو مرزا لیاقت علی صاحب صفوی کے چھوٹے بھائی مرزا ضامن علی غازی سے بیاہ دیا (دسمبر ۱۹۲۸ء) سسرال میں ان کی شاعری کو اچھی سرپرستی ملی۔ اکرام علی صاحب صفوی کو ذوق سخن تھا۔ انھوں نے نہ صرف قدر دانی اور ہمت افزائی کی بلکہ ان کے کلام کی اصلاح کے لئے حضرت صادق حسین غبار کا انتخاب کیا جو مہاراجہ سرکشن پرشاد کے خاص درباری شاعر تھے۔ حضرت غبار نے ان کے کلام کو دیکھ کر ابتدا ہی سے کہہ دیا تھا کہ اصلاح کی حاجت نہیں۔ اس کے بعد علی حیدر نظم طباطبائی اور ابو ظفر عبد الواحد صاحب نے ان کے کلام کو دیکھا اور مشورے دیتے۔ آپ کا کلام ابتدا ہی سے عصمت۔ ساقی۔ انکشاف وغیرہ میں شائع ہوا۔

خود مرزا ضامن علی غازی نے بھی اپنی شریک حیات کی ہمیشہ ہمت افزائی کی اور ان کی شاعری کی جی جان سے قدر کی۔ اس کے لئے سازگار ماحول فراہم کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ بشیر النسا بیگم اس حیثیت سے بڑی خوش نصیب تھیں کہ ان کو مزاج شناس اور شعریت نواز شوہر ملا۔ دونوں شریک زندگی ہی نہیں ایک جان دو قالب تھے۔ باہمی محبت اور ہم خیالی مثالی حیثیت رکھتی تھی۔ آج بھی غازی صاحب کی زندگی کا مطمح نظر بشیر النسا بیگم کے علمی و ادبی ورثہ کی ترتیب و اشاعت ہے جو انھوں نے غیر مطبوعہ کلام کی صورت میں چھوڑا ہے تاکہ وہ زمانہ کی دست برد سے محفوظ رہے۔ اس کے علاوہ "ذکر بشیر" کی اشاعت بھی ان کے پیش نظر ہے بشیر النسا بیگم کی زندگی سے متعلق بیش بہا ذخیرہ جو خطوط، تصاویر وغیرہ کی شکل میں ہے اس کو محفوظ کرنا ظاہر ہے کہ ادب کی بڑی خدمت متصور ہے۔ دراصل یہ دونوں کام ضامن علی صاحب کی ذمہ داریاں بھی ہیں۔

بشیر کی شخصیت پر وقار تھی جس میں جاذبیت تھی حضرت خواجہ حسن نظامی جن سے بشیر کو بڑی عقیدت تھی ان کی نفاست طبعی اور سلیقہ شاعری کی مناسبت سے ان کو "چمن آرا" کہا کرتے تھے اور ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ وہ حیدرآباد کی تہذیب کی نمائندہ اور اسلامی معاشرت کی بہترین نمونہ تھیں۔ ہر جگہ ممتاز اور نمایاں نظر آتی تھیں۔ ان کی شخصیت قدیم و جدید رجحانات کا خوش گوار امتزاج تھی جس میں قدیم انداز زیادہ نمایاں تھا۔ طبیعت میں سادگی تھی اور نمود و نمائش سے بہت دور تھیں۔ ؎ کہ بے نیاز نمائش ہے میری رنگینی پابند صوم و صلوٰۃ تھیں بجز نسوانی جلسوں کے عام اسٹیج پر نمودار نہ ہوئیں۔ باتیں کرنے میں ملائمت کے ساتھ وقار ظاہر ہوتا

تھا پر مغز اور صاحب الرّائے خاتون تھیں۔ باکمال شاعر ہونے کے علاوہ اچھی مقرر بھی تھیں۔ نثر نگاری پر بھی آپ کو بڑی قدرت تھی آپ کے مضامین "میری شاعری" اور "مجھے پسند ہے اقبال" کو اردو نثر میں اونچا درجہ دیا جا سکتا ہے۔

ان کے پسندیدہ شاعر اقبالؔ تھے جن سے ان کو بے پناہ عقیدت تھی انھوں نے اقبال کی رحلت پر ایک نظم "اقبال سے" لکھی جس کی ابتدا یوں کی ہے۔ ؏

مدّت سے تمنا تھی کہ لاہور کو جاؤں
اور سامنے اقبال کے سر اپنا جھکاؤں

پھر ایسے سوالات کئے ہیں جو منت کش جواب نہ ہوئے اور آخر میں کہا۔ ؏

اس تک نہ گئی جب یہ صدائے دل محزوں
اللہ نہ کرے میں کبھی لاہور کو جاؤں

دوسری نظمیں داستان اقبال۔ رحلت اقبال۔ اقبال کی آرام گاہ۔ بہار آخریں (ارمغان حجاز کو دیکھ کر) ہیں ان کے ایک ایک لفظ سے اقبال سے کمال عقیدت کا اظہار ہوتا ہے۔ خود بشیر کے کلام میں بھی اقبال کا رنگ جھلکتا ہے۔

بشیر اردو کی ایسی صاحب دیوان اور باکمال شاعرہ ہیں جن پر نہ صرف اہل دکن بلکہ اردو دنیا کو فخر ہو سکتا ہے۔ ان کا کلام ستھرا اور پاکیزہ ذوق کا آئینہ دار ہے۔ زبان اور اسلوب کی پاکیزگی پائی جاتی ہے۔ ان کو شاعری پر قدرت حاصل ہے۔ ان کی طبیعت میں جو لچک نرمی اور خوش خلقی تھی وہ ان کے اشعار میں بھی نمایاں ہے۔ ان کے ہاں نظم کا معنوی اہتمام پایا جاتا ہے۔

بشیر نے اپنے آپ کو کسی ایک صنف سخن کا پابند نہیں بنایا۔ اسی طرح ہر موضوع

کو اپنایا۔ معاشرے کی خرابیوں کا بھی بیان کیا اور محاسن کا بھی۔ انھوں نے کبھی عملی سیاست میں حصہ نہیں لیا لیکن ان کے اشعار میں سیاسی خیالات کی ترجمانی ہوئی ہے۔ حالات زمانہ پر ان کی نظر تھی۔ قوم کو انھوں نے اپنے مشوروں سے نوازا۔ ان کے کلام میں اتنا تنوع ہے کہ کلام کا مطالعہ ایک دفعہ شروع کریں تو چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا۔

ڈاکٹر زور نے ہمیشہ آپ کے کلام کو قدر کی نگاہ سے دیکھا مداح رہے اور آپ کو بڑھاوا دیا۔ انھوں نے بشیر کی شاعرانہ صلاحیتوں کا پورا پورا اندازہ لگایا۔ ڈاکٹر زور ہی کی خواہش پر وہ ادارہ ادبیات اردو سے اعزازی طور پر وابستہ ہوئیں۔ آپ ادارہ ادبیات اردو کے شعبہ نسواں کے بانیوں میں سے تھیں اور ایک عرصہ تک شریک معتمد کی حیثیت سے کارگزار رہیں۔ وہ اور ان کے شوہر ہمیشہ ادارہ کے کاموں میں ڈاکٹر زور کا ہاتھ بٹاتے رہے چنانچہ ادارہ نے دونوں کو اپنا رفیق بھی منتخب کیا۔ ڈاکٹر زور ہی کے اصرار پر آپ کا پہلا مجموعہ "آبگینۂ شعر" کے نام سے ۱۹۴۸ء میں ادارہ ادبیات اردو سے شائع ہوا۔ اس میں الفاظ کی موزونیت بھی ملتی ہے اور محاوروں کی برجستگی بھی، بندشوں کی دلکشی بھی ہے اور خیال کی بلندی بھی۔ فکر کی گہرائی نے ان کے اشعار میں صوری اور معنوی اعتبار سے ایک خاص رنگ تغزل پیدا کر دیا ہے۔ ڈاکٹر زور نے آبگینۂ شعر پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کے نام اپنے ایک خط میں لکھا۔

"لیکن افسوس ہے کہ جب لوگ اس کے نشہ میں جھومیں گے اس وقت آپ اور ہم موجود نہ رہیں گے تاہم اس کا تو اطمینان ہے کہ لوگ اس سے ضرور لطف اندوز ہوں گے" خود بشیر نے آبگینۂ شعر کے تعلق سے کہا۔

مرا ضمیر ہے بے تاب جستجو اس میں یا
جھلک رہی ہے مرے دل کی آرزو اس میں
بشیرؔ کیا کہوں کیا شئے ہے آبگینہ شعر
مری سرشت ہے خود میرے روبرو اس میں

بقول ڈاکٹر زورؔ جس کا اظہار انھوں نے یم۔اے کی کلاس میں کیا تھا اور جس کے راوی رشید قریشی ہیں "اردو شاعری کو کسی نے خیالی نزاکت، کسی نے جذباتی حدت دی ہے لیکن بشیرؔ نے سب سے بڑا احسان کیا ہے اس نے اردو کو شرافت سے نوازا ہے۔" ڈاکٹر زورؔ نے بشیرؔ کو ادبی دنیا سے ان کی بلندیوں کے ساتھ روشناس کروانے میں بڑا اہم رول ادا کیا ورنہ فطری انکساری اور کسر نفسی کے باعث وہ متعارف نہ ہوتیں۔

آپ کا غیر مطبوعہ سرمایہ بھی کافی ہے۔ اگر زیور طباعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آجائے تو اردو ادب میں قابل قدر اضافہ ہوگا۔

حیدرآباد کی نامور خواتین میں مسز سروجنی نائیڈو۔ سکینہ بیگم۔ بیگم صغری ہمایوں مرزا حیا بیگم بہادر یار جنگ اور لیڈی حیدری آپ کی ہمعصر تھیں۔۔۔۔
آپ ایک عرصہ تک انجمن خواتین دکن کی روح رواں رہیں۔

۲ر فروری ۱۹۷۲ء کو ایک طویل علالت کے بعد دکن کی باکمال شاعرہ نے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کی اور قدردانوں کی ایک بڑی تعداد کو اپنے پیچھے سوگوار چھوڑا۔

ایک صحافی

بیت الامت[1] بیگم بازار سے دارالسلام[2] کا فاصلہ ہو یا مغل پورہ میں انتخاب جنگ کی ڈیوڑھی[3] سے باغ مرلیدہر[4] کا فاصلہ جو بظاہر دو میل کا معلوم ہوتا ہے حقیقت میں ز اندازاً ایک صدی کا فاصلہ ہے ان فاصلوں کو طے کرنا ہمت و عزم کا کام ہے۔ اس کے لئے نظر کی وسعت بھی چاہئے اور دل کی تڑپ بھی۔

جو باہمت لوگ ایسے فاصلے طے کر لیتے ہیں ان کے لئے تہذیبوں کے فاصلے مذاہب کے فاصلے۔ رنگ و نسل کے فاصلے۔ نقاط نظر کے فاصلے کوئی حقیقت نہیں رکھتے وہ ایسی ہمہ گیریت حاصل کر لیتے ہیں جو تمام ذہنی فاصلوں کو خاطر میں نہ لاکر اپنے اندر سمو لیتی ہے اور ایسا نقطۂ مفاہمت بن جاتے ہیں جو متضاد نقطۂ نظر رکھنے والوں کے لئے سر جوڑنے کے سامان مہیا کرتا ہے۔

۱۹۴۲ء میں جب حیدرآباد میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام عمل میں آیا اور

---

[1] حیدرآباد میں نواب بہادر یار جنگ کی ڈیوڑھی [2] نواب بہادر یار جنگ کی جدوجہد کا مرکز [3] جہاں جناب عابد علی خاں صاحب کی پرورش ہوئی [4] جہاں روزنامہ سیاست کا دفتر ہے

جشن یادحالی کے لئے بابائے اردو مولوی عبدالحق حیدرآباد تشریف لائے تو قاضی عبدالغفار اور بابائے اردو کو جن میں باہمی کشیدگی ہونے کے باعث اجتماع ضدین کہہ سکتے تھے ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا معمولی بات نہ تھی۔ جناب عابد علی خاں نے جو انجمن ترقی پسند مصنفین کے سکریٹری تھے اس بظاہر ناممکن بات کو ممکن بنا دیا یہی نہیں بلکہ محترمہ سروجنی نائیڈو اور مولوی ابوالحسن سید علی صاحب قائد اتحادالمسلمین نے بھی جلسہ میں شرکت کی۔ یہ تو ایک معمولی سی مثال تھی۔

جب میں جناب عابد علی خاں کی زندگی اور ان کے کارناموں پر نظر ڈالتا ہوں تو یہ بات نمایاں نظر آتی ہے کہ زندگی میں جو تنوع ہے اس کو انھوں نے اس انداز سے اپنے اندر جذب کر لیا ہے کہ ان کی شخصیت مختلف رنگوں کی خوبصورت آمیزش اور مختلف طرز اور مکاتب کا حسین امتزاج معلوم ہوتی ہے۔

اس بظاہر سادہ لوح منکسرالمزاج اور خاموش طبیعت انسان کے دل میں جو تڑپ، درد، دھڑکنیں، اور جذبات ہیں اس کو پوری طرح سمجھنے کے لئے اس حیدرآباد کی تاریخ کو سمجھنا پڑے گا جس کا ایک دور ختم ہو رہا تھا اور دوسرا دور شروع ہو رہا تھا کسی بھی ملک کے لئے ایسا دور تکلیف دہ ہوتا ہے لیکن تبدیلی زمانہ کا مقدر ہے۔

یہ جناب عابد علی خاں کی بدقسمتی تھی کہ وہ ایسے دور میں پیدا ہوئے جب کہ جاگیردارانہ نظام اپنی افادیت کا دور ختم کر کے زندگی کے آخری سانس لے رہا تھا انھوں نے اپنی طبیعت کی افتاد کے تحت جاگیردارانہ ماحول میں پرورش پانے کے باوجود نہ صرف عوام کے جذبات و احساسات کو سمجھا بلکہ زمانہ کی نبض کو پہچانا ان کو

ایک دور کے ختم ہونے کا احساس تھا اور اس کا غم لیکن کف افسوس ملنے سے وقت اپنا فیصلہ نہیں بدلتا یہ جناب عابد علی خاں اچھی طرح جانتے تھے۔ وہ آنے والے دور میں عوام کی امنگوں کو بھی دیکھ رہے تھے اور اس کا استقبال کرنا چاہتے تھے یہ باتیں ان کے بزرگوں کی سمجھ میں آنے والی نہ تھیں جو نئے دور کے تقاضوں سے ناواقف تھے ان کے نزدیک جاگیردار خاندان کا چشم وچراغ ایسے راستہ پر جارہا تھا جو اس کے شایانِ شان نہ تھا۔ جو گھرانہ کی روایات کے خلاف تھا۔

میں نے اوپر کہا ہے کہ ایسے دور میں پیدا ہونا عابد علی خاں کی بدقسمتی تھی جی ہاں بدقسمتی اس لئے کہ وہ اپنے بزرگوں کو یہ نہیں سمجھا سکے کہ وہ جس کام کو زندگی کا مشن بناکر انجام دینا چاہتے ہیں وہ نہ صرف ان کے خاندان کے نام کو روشن کرے گا بلکہ ملک کو بھی ایسے دور میں جب کہ بعض گوشوں میں اندھیرا چھایا ہو روشنی فراہم کرے گا۔ اپنے فکر وخیال کی انفرادیت اور بزرگوں کی ناراضی کے تردد وتفکر کے باعث انھیں مرض دق لاحق ہوگیا لیکن قدرت کو ان سے کچھ کام لینا تھا۔ کاش جاگیردار طبقہ کے افراد کو یہ معلوم ہوتا کہ ان کے پاس وہ خزانے موجود ہیں جن کی نئے دور کو حاجت ہے ان کے آئینہ خانوں سے باہر آنے اور عوام کے رخ کو پہچاننے کی ضرورت تھی۔ دورِ جدید ان کا خیر مقدم کرتا ان کی قدر کرتا جو بات جناب عابد علی خاں کے لئے بدقسمتی تھی اس کو انھوں نے اپنے طرزِ عمل سے ملک اور قوم کے لئے خوش قسمتی کا موجب بنادیا۔

جب نئے دور کی تعمیر میں قدیم روایات اقدار اور اصولوں کے مسالے فراہم ہوتے ہیں تو یہ نئے دور کی خوش قسمتی ہے یہ مسالے جناب عابد علی خاں نے فراہم کئے۔

جناب عابد علی خاں کا تعلق جنوبی ہند کے مشہور خاندان اہل نائطہ کی شاخ

دلوائی سے ہے ۔ آپ کا سلسلہ نسب خلیل عرب کے توسط سے سیدنا اسماعیلؒ بن حضرت سیدنا امام جعفر صادق تک پہنچتا ہے خلیل عرب پہلے شخص تھے جو بصرہ سے کوکن آئے خلیل عرب کی اولاد میں حاجی محمد مخدوم رحمۃ اللہ علیہ بڑے پایہ کے بزرگ تھے جن سے علی عادل شاہ کو خاص عقیدت تھی ۔ اسی طرح حاجی عبدالقادر معتبر خاں عالمگیری ملا احمد نایتہ وزیر اعظم بیجاپور کے بھانجہ اور داماد تھے ۔ آپ کے جد اعلیٰ شاہ محمد حسن علی نائطی المعروف بہ ڈولچی شاہ سے نواب ناصر الدولہ بہادر کو عقیدت تھی ۱۲۸۴ ہجری میں آپ کا وصال ہوا ۔ نام پلی[1] میں آپ کا مزار ہے ۔ حضرت ڈولچی شاہ کے فرزند نواب ناصر علی خاں تھے جن کو نواب افضل الدولہ بہادر کی اتالیقی کے لئے منتخب کیا گیا تھا ۔ نواب ناصر علی خاں کے دو فرزند عابد علی خاں صولت جنگ اور حافظ علی خاں انتخاب جنگ تھے اول الذکر آپ کے نانا اور موخر الذکر آپ کے دادا تھے ہر دو کو اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں کی کم سنی کے زمانہ میں اتالیقی کا اعزاز ملا ۔

شمس العلماء نواب عزیز جنگ ولا اپنے ہم عصر نواب انتخاب جنگ کے متعلق اپنی شہرہ آفاق تصنیف تاریخ النوائط میں لکھتے ہیں ۔

"پبلک خدمات میں آپ کا قدم ہمیشہ آگے رہتا ہے ۔ غربائے قوم کے ساتھ ہمدردی آپ کی اعلیٰ صفت ہے ۔ عرصہ تک آپ میونسپل بورڈ کے ممبر رہے اور اور ایک خاص مدت کے لئے وائس پریسیڈنٹ کے خدمات کو سرانجام دیا ۔ نہایت

---

[1] حیدر آباد کا ایک محلہ ۔

روشن خیال اور خاص دلچسپی کے ساتھ اپنے فرائض خدمات کو ادا کرتے ہیں ۔ آپ کے گھر کے چراغ درویش علی خاں اور محمود علی خاں دو ہونہار صاحبزادے ہیں ۔"

نواب محمود علی خاں کے چوتھے فرزند جناب عابد علی خاں ہیں ۔ جناب عابد علی خاں ۱۹۲۰ء میں بمقام حیدرآباد پیدا ہوئے ۔ آپ کی ابتدائی تعلیم مدرسہ عالیہ میں ہوئی جہاں سے آپ نے میٹرک کا امتحان پاس کیا اس کے بعد اس دور کے روایتی طریقہ پر نظام کالج میں داخلہ کی بجائے جامعہ عثمانیہ کا رخ کیا یہ آپ کی عوامی زندگی سے وابستگی کا پہلا اظہار اور ایک اہم اقدام تھا جس نے آپ کے مستقبل کے رخ کو متعین کیا ۔ جامعہ عثمانیہ میں داخلہ کے بعد آپ نے علمی ادبی سیاسی اور سماجی تحریکات سے دلچسپی لینی شروع کی ان ہی دنوں آپ کی ملاقات مخدوم محی الدین سے ہوئی اور ترقی پسند ادبی تحریک سے دلچسپی پیدا ہوئی انھوں نے فلسفہ سے بی ۔ اے کی تکمیل ۱۹۴۲ء میں کی ۔ راقم الحروف نے بھی اسی سال بی ۔ اے کی تکمیل کی ۔ ہم دونوں ایک ہی زمانہ میں اقامت خانہ الصنیر میں تھے ۔

دوران تعلیم ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم اور پروفیسر میر ولی الدین انھیں بے حد عزیز رکھتے تھے فلسفہ کے موضوع نے شعور و فکر کے استحکام میں اہم حصہ لیا ۔

گریجویشن کی تکمیل کے بعد مولانا سید شاہ صابر حسینی صاحب سجادہ نشین درگاہ حضرت شاہ خاموشؒ کی صاحبزادی سے آپ کی شادی ہوئی ۔ اس تقریب میں اعلےٰ حضرت عثمان علی خاں نے بھی شرکت فرمائی یہ بات اس زمانہ میں باعث اعزاز و افتخار تھی ۔

آپ کے والد کی خواہش تھی کہ آپ سرکاری ملازمت حاصل کریں مگر آپ پر ان دنوں عوامی اور ترقی پسند تحریکات کا اثر بڑھ رہا تھا۔ چنانچہ ۱۹۴۴ء میں جب کمیونسٹ پارٹی پر سے پابندی اٹھائی گئی۔ اور پارٹی کی پہلی کانفرنس بمبئی میں منعقد ہوئی تو آپ نے اس میں مخدوم محی الدین کے ساتھ شرکت کی آپ پارٹی رکن نہ تھے لیکن ہمدرد ضرور تھے۔ بمبئی میں آپ کو سجاد ظہیر صاحب کے پاس ٹھہرایا گیا پروفیسر نورالحسن بھی یہیں ٹھہرے تھے علی سردار جعفری۔ سبط حسن اور دوسرے کئی ادیبوں سے ملاقات ہوئی ان سے درخواست کی گئی کہ وہ کارل مارکس کی کتاب **Wage Labour & Capital** کا اردو میں ترجمہ کریں ان دنوں پارٹی اشتراکیت پر کتابیں شائع کر رہی تھی آپ نے بہت جلد یہ ترجمہ مکمل کر لیا جسے ایک ترقی پسند اشاعت گھر نے شائع کیا۔ آپ نے جمہوریہ چین اور مشاہیر چین دو کتابیں لکھیں جو حیدرآباد سے شائع ہوئیں۔

ان ہی دنوں انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام عمل میں آیا جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے آپ نے ان جلسوں میں ڈاکٹر سید عبداللطیف کو بھی مدعو کیا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف آپ پر ہمیشہ شفقت کی نظر رکھتے تھے۔

۱۹۴۵ء میں ڈاکٹر زور نے حیدرآباد میں ایک عظیم الشان اردو کانفرنس منعقد کی جس میں شیخ عبدالقادر۔ خواجہ حسن نظامی۔ سر محمد یعقوب کے علاوہ غیر منقسم ہندوستان کے کئی نامور ادیب و شاعر جمع تھے۔ ڈاکٹر زور نے ترقی پسند ادب کے شعبہ کا کنوینر عابد علی خاں کو مقرر کیا جس کی صدارت جناب سجاد ظہیر نے کی۔

عابد علی خاں اس وقت محکمہ نشر و اشاعت میں ترقی کر کے مددگار ناظم ہو چکے

تھے۔ والدین ان کی سرگرمیوں کو ناپسند کرتے تھے۔ اعلیٰ عہدہ داروں نے ان کے والد سے شکایت بھی کی کہ وہ کمیونزم سے قریب تر ہو رہے ہیں انھیں روکا جائے۔ لیکن یہاں لگن اور دھن کا یہ عالم تھا ؎

وہ بھلا کس کی بات مانتے ہیں

بھائی "عابد" تو کچھ دوانے ہیں

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ ۱۹۴۸ء میں آپ نے سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور روزنامہ سیاست کے اجرا و اشاعت کے لئے درخواست دے دی ان کے بائیں بازو کے خیالات کے باعث یہ اجازت ذرا تاخیر سے منظور ہوئی۔ ۱۵ راگست ۱۹۴۹ء سے آپ نے اخبار سیاست نکالنا شروع کیا۔

میں نے اوپر جن روایات اقدار اور اصولوں کا ذکر کیا ہے ان کو عابد علی خاں نے سیاست کی بنیاد میں بڑی فراخ دلی سے استعمال کیا۔ خاندانی وجاہت اب دیوڑھی سے نکل کر ایک عوامی اخبار کی سرشت بن گئی دوستی خلوص اور محبت سے ایسے کارکن فراہم کئے جو اپنی جگہ ادارہ اور تاریخ ساز شخصیت ہیں۔

"سیاست" نے گذشتہ ربع صدی میں اپنا جو مقام پیدا کر لیا ہے وہ تو ایک کھلی ہوئی بات ہے لیکن عابد علی خاں نے اپنے خاندانی وقار کو اس میں جس انداز سے سمو کر زندہ جاوید بنا دیا ہے وہ محسوس کرنے کی چیز ہے Visualise کرنے کی چیز ہے۔

عابد علی خاں نے سیاسی سرگرمیوں اور اردو تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا لیکن بے غرضی اور خلوص کے ساتھ اردو ہال کی تعمیر کے سلسلہ میں آپ نے ذاتی

کوشش سے کلچرل پروگرام کے ذریعہ دس ہزار روپیہ جمع کئے ۔ انجمن ترقی اردو حیدرآباد نے ۱۹۵۴ء میں کانفرنس منعقد کی ایسے نازک دور میں جب کہ مدارس میں اردو تعلیم کے خاتمہ اور اردو اساتذہ کی علیحدگی، مسئلہ بنی ہوئی تھی آپ کی کوششوں سے مسٹر گوپال راؤ کھوٹے نے جو اس وقت وزیر تعلیم تھے اردو کے لئے مراعات کا اہم اعلان کیا ۔

۱۹۶۰ء میں انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کی کانفرنس منعقد ہوئی تو آپ اس کے کنوینر تھے اس کانفرنس میں چیف منسٹر ڈی ۔ سنجیویا گورنر بھیم سین سچر اور اسپیکر کالیشور راؤ نے اردو کے تعلق سے اہم اعلانات کئے ۔ یہ اعلانات آپ ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھے چنانچہ ڈاکٹر زور نے ایوانِ اردو میں آپ کا خیر مقدم کیا اور مولانا حفظ الرحمان نے آپ کو مبارک باد دیتے ہوئے آپ کی خدمات کو قابل فخر قرار دیا ۔

بے لوث خدمت اور سیاسی جماعتوں سے غیر وابستگی کے باعث آپ کو ہمیشہ دانشوروں کی تائید اور حمایت حاصل رہی ہے ۔ ریاستی تنظیم جدید کے بعد ڈاکٹر بی رام کرشنا راؤ نے آپ کو اسمبلی کی رکنیت کے لئے مجبور کیا اور ٹکٹ بھی دیدیا لیکن آپ نے عملی سیاست اور پارٹی بیل سے دور رہنا پسند کیا ۔ اسی طرح لوک سبھا کے لئے شہر حیدرآباد سے امیدوار بننے کا مشورہ دیا لیکن آپ نے غیر جانبدارانہ ترقی پسند پالیسی کے ذریعہ عوامی خدمت کو ترجیح دی ۔

آپ نے ۱۹۶۵ء میں سویٹ یونین اور فن لینڈ کا دورہ کیا ۔ تاشقند میں آپ ایک ماہ تک رہے حکومت امریکہ کی دعوت پر آپ نے ۱۹۶۹ء میں وہاں کے انتخابات

کا مطالعہ کیا۔ آپ یورپ کے مختلف ممالک اور مشرق بعید میں جزیرہ ہوائی جاپان اور ملائشیا کا دورہ کر چکے ہیں ۱۹۷۲ء میں آپ نے نائب صدر جمہوریہ جی ایس پاٹھک کے ہمراہ افغانستان کا دورہ بھی کیا۔

حکومت ہند نے ۱۹۷۱ء میں آپ کو گجرال کمیٹی کا رکن مقرر کیا ہے۔

ان دنوں جناب حبیب الرحمٰن صاحب کے بیرون ملک جانے کے باعث آپ انجمن ترقی اردو اور آرٹس کالج کے کارگذار سکریٹری ہیں نیز آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈمی اور مولانا آزاد اورینٹل انسٹی ٹیوٹ کی مجلس عاملہ کے رکن ہیں۔

گذشتہ مہینہ آپ کو پریس ٹرسٹ آف انڈیا کے بورڈ آف ڈائرکٹرز میں شامل کیا گیا ہے۔ اس حیثیت سے آپ اردو اخبار کے پہلے ایڈیٹر ہیں جنھیں یہ اعزاز دیا گیا۔

۱۹۷۱ء میں آپ کو حج کی سعادت حاصل ہوئی۔ آپ پابند صوم وصلوٰۃ ہیں روزانہ صبح پابندی سے تفسیر قرآن پڑھتے ہیں۔

قوالی اور اس کے وارث

جس طرح مسلمانوں نے ہندوستان آنے کے بعد اپنی سیاسی اور ملکی ضروریات کے پیش نظر موجود اور مروجہ مسالوں سے تہذیب و تمدن کی صورت گری کی ۔ ملک میں جو زبان رائج تھی اس کو اپنا کر اس کو ترقی دی اور ہندوستان کے لئے ایک مشترکہ زبان کی داغ بیل ڈالی۔ فن تعمیر و مصوری میں جس فن کو موجود پایا اس میں حالات و ضروریات کے لحاظ سے ضروری ترمیم و اصلاح کی ۔ اس طرح فن موسیقی میں بھی مروجہ اور مقبول عام راگوں اور دھنوں کو اپنا کر اور بیرونی اجزاء کا امتزاج پیدا کر کے اس کو بھی اپنے خیالات اور پیغام کی ترویج کے لئے استعمال کیا۔ اس کو اپنانے کی سب سے نمایاں مثال قوالی ہے جس کا سہرا حضرت امیر خسرو کے سر ہے ۔ حضرت امیر خسرو نے ہندی اور فارسی راگوں کے امتزاج سے جو طرح طرح کے راگ اختراع کئے ان میں قول بھی ہے جو بعد میں مخصوص قسم کا گانا قوالی بن گیا۔ اس میں تصوف کا کلام گایا جاتا ہے ۔ قول کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبر اسلام یا بزرگان دین کا کوئی قول بجنسہ کسی راگنی میں ڈھال لیا جائے ۔ الفاظ اور مصرعوں کی تکرار سے تاثر پیدا کیا جاتا ہے ۔ اہل دل پہ اس طریقہ کا اتنا اثر ہوتا

ہے کہ ان پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے ۔

دو تہذیبوں کی سنگم سے علوم، زبان اور فنون لطیفہ کو اس شاندار طریقہ پر ترقی دینا اور اس ترقی کو محدود حلقوں سے نکال کر عام کرنا اور مفادِ عامہ کے لئے استعمال کرنا تاریخ عالم کا ایک عجیب و غریب اور حیرت انگیز واقعہ ہے ۔ یہ کام وقت کی ضرورت تو تھا ہی اس کو نووارد قوم کی وسیع النظری بھی کہہ سکتے ہیں ۔ اس تاریخ ساز کام کو صوفیائے کرام نے شعوری طور پر انجام دیا عوام سے ربط و ضبط بڑھانے کے لئے جو کام اردو سے لیا گیا وہی کام سنگیت کی اس نئی اختراع سے بھی لیا گیا معنوی لحاظ سے بھی قوالی اردو ہی کی طرح ہے ۔

شہنشاہ اکبر بھی موسیقی کے بڑے شائق تھے ۔ ان کی سرپرستی میں موسیقی کو ترقی ہوئی غیر ملکی راگوں کو ہندی راگوں سے ملا کر نئی صورتیں پیش کی گئیں ۔ ان کے عہد میں برندابن کے رہنے والے فقیر ہری داس، تان سین کے استاد تھے ۔ تان سین گوالیار کے رہنے والے تھے ۔ اکبر کے وزراء میں مان سنگھ گوالیاری موسیقی کے بڑے سرپرست تھے ۔ لیکن بادشاہوں سے زیادہ اہل تصوف نے موسیقی کی سرپرستی کی ۔ ہندوستانی موسیقی کو عہد وسطیٰ میں جو اوج اور عروج نصیب ہوا وہ تمام تر نہیں تو بہت کچھ خانقاہوں کے زیر اثر تھا ۔

یہ خیال کہ قوالی وہی گانے والے ہیں جو مسلمانوں کے ساتھ ہندوستان آئے درست نہیں ہے ۔ سوائے اس کے کہ قوالی کی وضع کچھ بدلی ہوئی ہے اس میں وہی راگ ۔ راگنیاں اور دھنیں مروج ہیں جو بنیادی طور پر ہندوستانی موسیقی کی ہیں ۔ قوالی کوئی جداگانہ فن نہیں ہے اور نہ ان ممالک میں جہاں سے مسلمان آئے

قوالی جیسی کوئی چیز پائی جاتی ہے۔ فنی لحاظ سے قوالی بالکلیہ ہندی راگوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ قوالی ایک فن کار کا نہیں بلکہ ایک ٹولی کا گانا ہوتا ہے جس میں آٹھ دس فنکار شریک ہوتے ہیں۔ البتہ اس ٹولی کی قیادت ایک گویا کرتا ہے۔ ڈھولک کی تھاپ اور تالیوں کی ضرب سے ایک خاص سماں بندھ جاتا ہے اور الفاظ کی تکرار سے روح پر عجیب کیفیت طاری ہوتی ہے۔ مضمون کے اعتبار سے بھی قوالی کی ایک ترتیب ہوتی ہے۔ عموماً قوالی، حمد یا نعت سے شروع کی جاتی ہے۔

شمالی ہند کی موسیقی کی ایک خصوصیت جو شاید کسی اور ملک کی موسیقی میں نہیں پائی جاتی یہ ہے کہ یہاں فن موسیقی کے گھرانے اہمیت رکھتے ہیں مثلاً دہلی والوں کا گھرانہ آگرہ والوں کا گھرانہ، گوالیار والوں کا گھرانہ، پٹیالہ والوں کا گھرانہ، تل ٹونڈی والوں کا گھرانہ، کولہا پور والوں کا گھرانہ، بہرام خاں کا گھرانہ وغیرہ، ان کو سنگیت کے مکتب خیال سمجھئے۔ ان میں سے ہر ایک کا اسلوب اور ڈھنگ دوسرے سے الگ ہوتا ہے۔ راگ اور تال تو وہی ہوتے ہیں لیکن ان کو برتنے اور پیش کرنے کا انداز جدا ہوتا ہے۔ یہ اس وجہ سے بھی ہے کہ موسیقی لکھی نہیں جاتی۔ استاد یا گرو سے سیکھی جاتی ہے۔ یہ فن صدیوں سے سینہ بہ سینہ چلا آتا ہے۔ ہر فن کار کسی خاص گھرانے سے سیکھتا ہے اور اسی انداز پر گاتا ہے وامن راؤ دیشپانڈے کی حالیہ کتاب "ہندوستانی موسیقی میں گھرانوں کا جمالیاتی مطالعہ" کے بموجب "خیال" کے چھ گھرانوں میں صرف جے پور کا گھرانہ جس کے بانی استاد اللہ دیا خاں تھے معیار پر پورا اترتا ہے اور اس گھرانہ کو خیال کی حد تک اونچا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ وامن راؤ دیشپانڈے کا اپنا خیال ہے۔

مغل شہنشاہوں نے فن موسیقی کی خاص سرپرستی کی جو آخر تک جاری رہی۔ آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر نے بے شمار موسیقاروں کو دربار سے وابستہ کر رکھا تھا۔ ان میں استاد تان رس خاں نے کافی شہرت پائی اور تمام شمالی ہند میں وہ استاد مانے جاتے تھے۔ ۱۸۵۷ء میں جنگ آزادی کے ظالمانہ ردعمل کے بعد درباری موسیقار تان رس خاں نے حیدرآباد کی راہ لی تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ تان رس خاں مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد دہلی سے گوالیار گئے پھر دتیا کے مہاراجہ کے پاس چلے گئے۔ ان کے بڑے بہنوئی اور چچازاد بھائی علی بخش خاں تھے۔ علی بخش خاں کے دو لڑکے محمد صدیق خاں اور حاجی عبدالرحمٰن خاں تھے اس خاندان میں قوالی کی ابتدا حاجی عبدالرحمٰن خاں ہی نے کی۔ حاجی عبدالرحمٰن خاں کو منجلے شاہ قبلہ صابری جب کہ وہ حج کو تشریف لے گئے تھے اپنے ساتھ حیدرآباد لائے۔ اس کے بعد عبدالرحمٰن خاں کے بڑے بھائی محمد صدیق خاں اور ان کے ماموں تان رس خاں کو بھی حیدرآباد آنے کی دعوت دی گئی تان رس خاں نے یہ شرط رکھی کہ شاہ دکن ان کی نذر قبول کریں جس کو اس بنا پر منظور کیا گیا کہ تان رس خاں کی نذر مغل شہنشاہ بہادر شاہ نے بھی قبول کی تھی۔ تان رس خاں کا انتقال حیدرآباد ہی میں ہوا اور درگاہ شاہ خاموش صاحبؒ میں سپرد خاک ہوتے۔ محمد صدیق صاحب کے تین لڑکے تھے۔ نثار احمد خاں، نذیر احمد خاں، اور نصیر احمد خاں۔ عزیز احمد خاں وارثی جو استاد نذیر احمد خاں کے فرزند ہیں۔ ۱۹۲۲ء میں بمقام حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ اس زمانہ میں جب کہ نذیر احمد خاں اور ان کے بھائی نثار احمد خاں کی طوطی بول رہی تھی نذیر احمد خاں کا اچانک انتقال ہو گیا اور عزیز احمد خاں بچپن ہی سے سایہ پدری سے محروم ہو گئے۔ والد کے انتقال کے بعد مشفق تایا نثار احمد خاں اور

چچا بابا نصیر احمد خاں سے موسیقی کا درس لیا اور چودہ سال کی عمر میں ایک ہونہار فن کار کی حیثیت سے منظرِ عام پر آگئے ۔

آج سے تقریباً ۲۰ سال قبل چہلہ خواجہ غریب النواز مغل پورہ میں اعلیٰ حضرت حضور نظام آصف جاہ سابع کے سامنے اپنے فن کو پیش کرنے کا موقعہ ملا۔ سرکار نے ان کی قوالی کو پسند فرمایا۔ اس سے ان کو شہرت حاصل ہوئی ۔ ان کے سرپرستوں میں نواب دین یار جنگ نواب مہدی نواز جنگ، نواب علی یاور جنگ، فیاض الدین صاحب اور حبیب اللہ حسینی صاحب ہیں۔ آخر الذکر دو اصحاب کو قوالی میں ایسی دلچسپی رہی جو اپنی آپ نظیر رہے ۔

حیدرآباد کی محفلوں میں اہل ذوق حضرات کی موجودگی نے عزیز احمد خاں کے فن کو بڑھاوا دیا لیکن عزیز احمد خاں کی اولین سرپرستی اور شائقین قوالی سے روشناس کروانے میں حضرت شیخین احمد شطاری کامل صاحب کا بڑا ہاتھ ہے جنھوں نے اپنی مخصوص ماہانہ محفل سماع میں عزیز احمد خاں کا نہ صرف اہلِ ذوق سے تعارف کروایا بلکہ قوالی کے آداب سے واقفیت کروایا ۔

عزیز احمد خاں ہر سال پابندی سے اجمیر شریف اور گلبرگہ شریف کے اعراس میں شریک ہوتے ہیں۔ اس سے بھی ان کے فن کے قدردانوں کا حلقہ وسیع ہوتا گیا ۔ تیس سال کی عمر میں عزیز احمد خاں نے فن میں کمال حاصل کیا ۔ انھوں نے غزل کو قوالی کے طرز پر گانے کی ابتدا کی اور موسیقی میں ان کی انفرادیت نے شائقین کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ اب ان کی آواز حیدرآباد سے باہر دہلی ۔ مدراس ۔ بمبئی ۔ کلکتہ وغیرہ میں گونجنے لگی اور ان کی شہرت بتدریج بڑھتی گئی ۔ ان کے قدردان ہندوستان

بھر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کی قوالی کے ریکارڈ "آیا بنا آیا"، صلی اللہ علیہ وسلم "در پیں حرفِ تمنا ہوں بڑی دیر سے چپ ہوں" کافی مقبول ہوئے۔ ۵؍اکتوبر ۱۹۷ کو صدر جمہوریہ نے ان کو پدم شری کا اعزاز دیا اس کے بعد ۱۹۷۲ء میں انھیں حکومتِ سعودی عرب کی جانب سے دعوت دی گئی وہ مشرق وسطیٰ سے ہوتے ہوتے حرمین شریفین گئے جدہ میں ان کا پروگرام شاندار پیمانہ پر ہوا۔ قوالی کے قومی پروگرام میں آل انڈیا ریڈیو دلی سے بھی انھیں مدعو کیا گیا۔

۳۰ستمبر ۱۹۷۳ء کو امرتسر ٹیلی ویژن کے افتتاح کے موقعہ پر بھی عزیز احمد خاں نے پروگرام پیش کیا جس کو محفوظ کر کے بعد میں دہلی دیژن سے بھی پیش کیا گیا۔

"اللہ ہو" کی آواز کی گونج پنجاب کی جس سرزمین میں گم ہو گئی تھی وہیں عزیز احمد خاں نے پھر ایک بار اسے بلند کر کے خوب داد تحسین حاصل کیا۔ چنڈی گڑھ کی ایک محفل میں جہاں مجھے بھی شرکت کا موقع ملا میں نے دیکھا کہ ان کی پیش کشوں کو سمجھا گیا اور پسند کیا گیا۔ نعتیہ کلام کو عقیدت واحترام سے سنا گیا۔ تصوف کے نکات اچھی طرح ذہن نشین ہو رہے ہیں یہ چہروں سے واضح ہوتا تھا فرمائشیں ہوئیں۔ سو سو اور پچاس پچاس کے نذرانے ہوتے مسلسل خوب خوب اور داد واہ ہوئی۔ ٹیپ پر صدا بندیاں ہوئیں اور صبح ہونے ہوتے چار و ناچار محفل برخاست ہوئی تو ایسے کہ ہر دل میں اشتیاق تھا اور تشنگی کا احساس۔

عزیز احمد خاں نے محنت کی تو یہ مقام حاصل کیا۔ ؎

راہ عمل میں شوق فراواں کی شرط ہے
جاتی نہیں ہے سعی طلب رائیگاں کبھی

آج ہم ان کو شہرت کے آسمان پر چمکتا دیکھتے ہیں۔ آج وہ ہم کو قوالی جیسے فن کے وارث بلکہ تنہا وارث نظر آتے ہیں تو اس کے پیچھے سخت محنت بھی ہے۔ موسیقی سے گہری دلچسپی اور دلی لگاؤ بھی ہے۔ سنگیت میں مقام پیدا کرنے کا پرخلوص جذبہ بھی ہے اور سب سے زیادہ بزرگانِ دین سے بے پناہ اور والہانہ عقیدت ہے۔

رحیم پالا

میں جب پہلی مرتبہ رحیم پالا سے ملا تو ایسے محسوس ہوا کہ انھیں ایک عرصے سے جانتا ہوں پہلی ہی ملاقات میں ان سے بے تکلفی ہوگئی اور ان کی سیدھی سادی باتوں کے درمیان میں نے دنیا کے ایک عام انسان کے دل کی پکار سنی۔ ایک اوسط درجہ کے کاروباری آدمی کے سینے کی دھڑکن۔

رحیم پالا سیاست کے درمیان رہتے ہیں اور سیاست کو اپنے انداز سے سمجھتے بھی ہیں لیکن انھیں کسی سیاست سے کوئی سروکار نہیں وہ صرف یہ جانتے ہیں کہ ان کی کاروبار کی کامیابی کا انحصار ان کی اپنی محنت اور اپنے علاقے کے فطری مناظر پر ہے اور ان دو کو کوئی ان سے نہیں چھین سکتا۔ اس لئے وہ ان ہی پر بھروسہ کرتے ہیں وہ مطمئن ہیں۔

رحیم پالا سرینگر کے ڈل لیک کے ایک رہائشی ناؤ یعنی ہاؤز بوٹ کے مالک ہیں سرینگر میں ڈال لیک نگین لیک اور چنار باغ وغیرہ میں تقریباً ۳۵۰ رہائشی ناؤ ہیں سب خانگی ملک ہیں ان کے مالک اوسط درجہ کے کشمیری ہیں جو کشمیر آنے والے سیاحوں سے راست ربط رکھتے ہیں اور کشمیر کی نمائندگی کرتے

ہیں۔ رحیم پالا ان میں سے ایک ہیں اور میرے لئے ان سب کے نمائندے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

رحیم پالا نے پہلے ہی دن ان تمام مقامات کی تفصیلات ہمیں بتلادیں جو دیکھنے کے لائق ہیں، یہ طے پایا کہ اگلے دن صبح ہی ہم شکارے میں سرینگر کے تمام مقامی جھیلوں کی تفریح کریں گے۔ ۸ بجے تک ناشتے سے فارغ ہوکر ہم گائڈ کو ساتھ لیکر روانہ ہوئے۔ لنچ ساتھ رکھ لیا گیا۔ ڈل جھیل تین جھیلوں پر مشتمل ہے۔ گگری بل، لوکرٹ ڈل اور بڈ ڈل ہم ہاؤس بوٹ نائو مظفر سے روانہ ہوکر نہرو پارک گئے جو ڈل لیک میں ایک چھوٹے سے خوبصورت جزیرے پر واقع ہے۔ یہاں سیاحوں کے لئے ایک ریسٹورنٹ ہے جہاں خورد و نوش کی اشیاء ملتی ہیں۔ پارک کے اطراف سائکل نائو تین روپیہ فی گھنٹہ کرائے پر ملتے ہیں۔ ایک نائو میں دو آدمی بیٹھ سکتے ہیں اور پیڈل گھما کر نائو کو چلایا جاسکتا ہے۔ یہاں سے چار چنار گئے یہ بھی جزیرہ ہے جس پر چار سایہ دار خوبصورت چنار کے درخت ہیں جو دور ہی سے دکھائی دیتے ہیں اور ڈل لیک کی خوبصورتی میں چار چاند لگاتے ہیں یہاں بھی ریسٹورنٹ ہے اور سائیکل نائو ملتے ہیں۔ یہاں سے چشمہ شاہی کے لئے روانہ ہوتے۔ یہاں ڈل لیک بہت کشادہ ہوگئی ہے۔ لیک کے درمیان سوئمنگ کا خاص اہتمام ہے۔ اس کے لئے خاص بوٹ مہیا ہیں جن پر سے پانی پر چھلانگ لگانے کے لئے تختے لگا لئے گئے ہیں۔ بوٹ کے اطراف تیرنے کے بعد پھر بوٹ میں آکر لباس تبدیل کیا جاسکتا ہے اگر یہ سہولت مہیا نہ کی گئی ہوتی تو لیک کے درمیانی حصے تک پہنچنا مشکل ہوتا۔

چشمہ شاہی جانے کے لئے جس جگہ شکارے سے اترتے ہیں وہاں سے چشمہ شاہی

تک کافی چڑھائی ہے۔ چشمہ شاہی، شاہی مغل گارڈن میں واقع ہے جو بالکل اصلی حالت میں رکھا گیا ہے۔ یہاں میوؤں کے درخت ہیں۔ جابجا خوبصورت پھولوں کیاریاں ہیں یہ قدرتی چشمہ پہاڑ سے نکلتا ہے پانی نہایت شفاف اور برف کے مانند ٹھنڈا اور فرحت بخش ہوتا ہے۔ شہنشاہ جہانگیر کے زمانے میں اس قدرتی چشمے سے فائدہ اٹھا کر باغ بنایا گیا تھا اس وقت سے یہ شاہی چشمہ کہلاتا ہے۔ پنڈت نہرو کو یہ جگہ بہت پسند تھی، ان کے قیام کے لئے ایک رہائش گاہ بنائی گئی ہے کہتے ہیں کہ اس چشمہ کا پانی صحت بخش اور ہاضم ہوتا ہے جو کوئی سیر کو آتا ہے سیر ہو کر پانی پیتا ہے۔ بازو ہی گورنر صاحب کی رہائش گاہ ہے جہاں چشمہ شاہی کا پانی پہنچایا گیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں بھی چشمہ کی قدر موجود ہے یہاں سے نشاط باغ گئے۔ یہ بھی مغلیہ دور کا باغ ہے۔ اس میں اخروٹ، سیب، بہی اور چیریز کے درخت اور رنگ برنگ کے پھولوں کی کیاریاں ہیں اور درمیان میں ہرے بھرے لان ہیں۔ پکنک کے لئے یہ جگہ بہت موزوں ہے۔ روزآنہ ہزارہا لوگ یہاں تفریح کو آتے ہیں۔ نشاط باغ میں لنچ کھا کر شکارہ سے شالیمار گئے۔ یہ بھی مغلیہ دور کا باغ ہے۔ مغل بادشاہ کشمیر کے خوب صورت مناظر کے دلدادہ تھے انار، انگور، زعفران اور چنار کشمیر میں مغل بادشاہوں کی دین ہیں انھوں نے کشمیر کے خوبصورت مناظر پر توجہ دی اور باغ موزوں مقامات پر بنائے یہاں نہ صرف تفریح کی سہولتیں مہیا کی گئی ہیں بلکہ یہاں سے خوبصورت مقامات کا نظارہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ شالیمار میں دوسرے مغل باغوں کی طرح میوؤں کے درخت پھولوں کی کیاریاں اور خوبصورت روشیں ہیں۔ درمیان میں فوارے ہیں جو ایک عرصے سے بند تھے۔ اب اُن کو درست کر کے پھر چالو کیا گیا ہے۔ یہاں ساؤنڈ اور لائٹ

کا پروگرام ہوتا ہے جو بہت دلچسپ اور معلومات آفریں ہوتا ہے ۔

شالیمار سے حضرت بل کو گئے یہ مقدس زیارت گاہ ہے جہاں پیغمبر اسلام کے موئے مبارک محفوظ ہیں جن کی زیارت سال میں صرف دس مخصوص دنوں میں ہوتی ہے اس وقت آثار شریف قدیم عمارت میں ہیں حفاظت کا خاص اہتمام اور پہرہ حکومت کی جانب سے ہے، جدید عمارت زیر تعمیر ہے جس کا نقشہ مشہور آرکٹکٹ فیاض الدین نظامی صاحب کا مرتب کیا ہوا ہے ۔ اندازہ ہے کہ یہ عالیشان عمارت ایک سال میں مکمل ہو جائے گی یہاں سے شکارہ کے ذریعہ نگین جھیل کو گئے یہاں پانی پر اسکیٹنگ ہوتی ہے ۔ یہاں اعلیٰ درجے کے رہائشی ناؤ ٹھہرتے ہیں یہاں سے اپنے رہائشی ناؤ کو واپس ہوئے ۔ دن بھر کی تکان سے سر میں درد ہو رہا تھا میں نے رحیم پالا سے اس کا ذکر کیا تو کچھ ہی دیر میں گرم گرم کشمیری چائے پیش کی جو نمکین ہوتی ہے اور کہا کہ جب نورجہاں کو درد سر ہوا تھا اور کسی دوا سے فائدہ نہ ہوا تو کشمیری چائے کا استعمال کیا گیا تھا اور سر کا درد فوراً ہو گیا تھا اس صراحت کے بعد ہم کو یہ نمکین چائے پینی ہی پڑی اور اقرار کرنا پڑا کہ ہمارا سر درد بالکل غائب ہو گیا ہے ۔

رحیم پالا نے کھانے میں روغن جوش تیار کیا تھا روغن جوش جو دنیا کی تمام ریسٹوران میں مینو کا اہم اور لازمی جزو ہوتا ہے خاص کشمیری سالن ہے روغن جوش جو یہاں پکایا جاتا ہے واقعی بڑی خاص چیز ہے ۔ دوسری چیز جو تیار کی گئی تھی گوشتابہ تھی جو گوشت اور دہی سے پکائی جاتی ہے ۔ ابھی تکان کا اثر باقی ہی تھا کہ رحیم پالا نے دوسرے دن کا پروگرام کچھ اس صراحت سے پیش کیا کہ ہم کو اشتیاق پیدا ہو گیا ہے ۔ طے پایا کہ اگلے دن ہم ذریعہ کار گلمرگ جائیں گے چنانچہ صبح ۸ بجے

ٹنگمرگ کے لئے روانہ ہوئے ٹنگمرگ تک راستہ بہت اچھا ہے کوئی چڑھائی نہیں ہے۔ یوں تو کشمیر کو قدرت نے دل کھول کر سنوارا ہے لیکن ٹنگمرگ جاتے ہوئے سڑک کی دونوں جانب کھلن مرگ کے پگھلے ہوئے برف سے جو نہریں بہتی ہیں وہ ایسا انداز رکھتی ہیں جس کا دنیا میں جواب نہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پانی بہہ نہیں رہا ہے اچھل رہا ہے کھلکھلا رہا ہے۔ قہقہے لگا رہا ہے۔

ٹنگمرگ سے دو راستے جاتے ہیں ایک درگاہ شریف حضرت بابا پیام الدین رح الموسوم بابا رشی کو جاتا ہے راستہ خام ہے لیکن اچھا ہے اس درگاہ کا انتظام معقول ہے حضرت بابا پیام الدین چندر نوگاؤں کے رہنے والے تھے اپنے مرشد کے حکم کے مطابق ٹنگمرگ میں گوشہ نشین ہو گئے۔ اور اپنے بلند کردار و عمل سے راہ راست سے بھٹکے ہوئے راہیوں کو سیدھے راستے پر لانے میں کامیاب ہو گئے۔ ۱۴۸۲ء میں آپ کا وصال ہوا جس کو ۵۰۰ سال کا عرصہ ہو گیا۔ یہاں ایک لنگر خانہ قائم ہے۔ اور زائرین کے قیام کا معقول انتظام ہے درگاہ شریف سے ٹنگمرگ واپس آکر گلمرگ کے لئے روانہ ہوتے۔ کافی چڑھائی ہے لیکن راستہ بہت اچھا ہے گلمرگ ان مقامات میں سے ہے جس کی بنا پر کشمیر کو جنت نظیر کہا جاتا ہے یہاں کے مناظر قابل دید ہیں ہوا خوش گوار اور فرحت بخش ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے فضا مسکرا رہی ہو موٹر صرف گلمرگ تک جاتی ہے یہاں سے کھلن مرگ کے برف پوش پہاڑوں تک چھ میل کی چڑھائی ہے اس مسافت کو طے کرنے کی دو صورتیں ہیں ایک تو گھوڑوں کے ذریعے جو کھلن مرگ آنے جانے کے لئے ساڑھے پانچ روپے لیتے ہیں دوسری صورت یہ ہے کہ گلمرگ سے کیبل کار کے ذریعہ ایک بڑی وادی

کو پار کرتے ہیں ۔ ہندوستان میں کیبل کار رواج بالکلیہ نئی چیز ہے کیبل کار ایک صوفہ نما کرسی ہوتی ہے جس میں دو آدمی بیٹھتے ہیں اور سامنے حفاظتی اڑ ڈنڈا لگا دیتے ہیں پھر یہ کار جو آہنی رسی پر آویزاں ہے چل پڑتی ہے ہم نے وادی کو ۵ امنٹ میں عبور کرلیا ۔ یہاں سے کھلن مرگ کا فاصلہ تقریباً ۳ میل ہے جس کو پیدل راستے سے ایک گھنٹہ میں عبور کیا جا سکتا ہے ۔ کھلن مرگ کے برفانی میدان کا شمار دنیا کے خوبصورت ترین مقامات میں کیا جا سکتا ہے ۔ یہاں سال کے ہر حصہ میں برف موجود رہتی ہے ۔ کھلن مرگ سے شام میں رہائشی ناؤ کو واپس ہوتے رحیم پالا نے آج رستابہ بنایا تھا جو خاص کشمیری پکوان ہے یہ کوفتوں کی قسم کا ہوتا ہے اس کے ساتھ میتھی کی بھاجی تھی جس کو خاص کشمیری طریقہ پر سرسوں کے تیل میں پکایا گیا تھا یہ بھاجی سچورو کے ساتھ ہو کلچوں کے اندا ایک قسم کی کشمیری روٹی ہے خوب مزہ دیتی ہے اگلے دن ذریعہ کار سونا مرگ کے لئے روانہ ہوئے جو سرینگر سے ۸۵ کلومیٹر ہے گندربل وائل، کنگن اور پھر بالائی سندھ برقابی پراجکٹ ہوتے ہوئے سونا مرگ پہنچے وہاں سے گھوڑوں پر تاجواز کے برف کی چٹانوں یعنی گلیسیرز تک گئے یہاں برف گاڑی یعنی Sledge پر پھسلتے ہیں جو بظاہر خطرناک معلوم ہوتا ہے لیکن جن لوگوں اس کام پر رکھا گیا ہے وہ بڑے مشاق ہوتے ہیں اور اجازت یافتہ ہوتے ہیں یہ بڑا دلچسپ کھیل ہے واپسی کے دوران میں نے رحیم پالا سے کہا کشمیر کو تو زیادہ تر خوشحال اور مالدار لوگ آتے ہیں تم کو ان سے کافی آمدنی ہوتی ہوگی رحیم پالا نے جواب دیا کشمیر آنیوالے خوش قسمت لوگ ضرور ہوتے ہیں لیکن ضروری نہیں کہ تمام خوش حال ہوں یہاں تمام دنیا سے لوگ آتے ہیں اکثر کشمیر کے ایک سیزن کے لئے چار چار پانچ پانچ سال تک

بچت کرتے ہیں تب اپنی زندگی کی خواہش کو پوری کرتے ہیں یہ لوگ اور تمام ہی لوگ کفایت شعاری برتتے ہیں جب ان کو مطمئن کیا جائے ان کو آرام سے رکھا جائے ان کو خوب تفریح کروائی جائے تب ہی معاوضہ دیتے ہیں اور وہ بھی سوچ سمجھ کر رحیم پالا نے کہا کہ ان کو باہمی مسابقت کا سامنا رہتا ہے یہ ضروری نہیں کہ ہر خوشحال اور مال دار آدمی کو یہاں آنا نصیب ہو بعض زیادہ مال دار لوگ یہاں آبھی جاتے ہیں تو کشمیر کا حقیقی لطف نہیں اٹھاتے۔ جب میں نے مسابقت کی بات سنی تو سوچا کہ واقعی کشمیریوں کو انفرادی طور پر کافی مسابقت کا سامنا رہتا ہے۔ ۲۵۰ رہائشیں ناؤ ہیں ان میں آپسی مقابلہ رہتا ہے شکارہ والوں پھیری والوں اور گائیڈز میں مسابقت رہتی ہے لیکن کشمیر کو کسی سابقت کا سامنا نہیں کیوں کہ دنیا میں اس جیسی کوئی اور جگہ ہے ہی نہیں اس لئے دنیا کے ہر حصہ کے لوگ اس مقام کو چلے آتے ہیں۔ جب مزید سہولتیں مہیا ہوں گی اور جلد مہیا ہوں گی مزید معلومات بہم پہنچائی جائیں گی اور یقیناً پہنچائی جائیں گی تو دنیا کشمیر کے متعلق سے اندھیرے سے اجالے میں آئے گی۔ تب کشمیر کو آنے والوں کی تعداد میں کافی اضافہ ہوگا۔ رحیم پالا اس دن کا انتظار کر رہا ہے

مصنّف کی دوسری کتابیں تبصروں کی روشنی میں

۱۔ اردو ترجمہ شری مد بھگوت گیتا

۱۔ منادی دہلی

نواب دین یار جنگ بہادر کے فرزند مولوی حسن الدین احمد صاحب نائب ناظم محکمہ مذہبی سری کرشن جی کی مشہور کتاب گیتا کا ترجمہ لائے تھے۔ جو انھوں نے نغمہ الوہیت کے نام سے شائع کیا ہے۔ میں نے اس کو دیکھا غیر معمولی خوبیاں اس ترجمہ میں ہیں۔ خاص کر سنسکرت کی مشکل باتوں کو ایسی آسان اور جامع زبان میں ادا کیا ہے کہ تعریف کرنے کو جی چاہتا ہے۔ پنڈت سندر لال صاحب نے اس پر ایک دیباچہ بھی لکھا ہے۔

(۲۴ر مارچ ۱۹۴۹ء)

۲۔ نگار لکھنو

نغمہ الوہیت اردو ترجمہ ہے بھگوت گیتا کا جسے حسن الدین احمد صاحب نے بہت صاف اور سلیس زبان میں کیا ہے۔ ابتدا میں پنڈت سندر لال کا مختصر سا مقدمہ بھی شامل ہے جس میں انھوں نے اس ترجمہ کو بہت سراہا ہے۔ بھگوت گیتا کا شمار چوٹی کی مذہبی کتابوں میں کیا جاتا ہے اور ہر اس شخص کو جو مذہبی مباحث میں دلچسپی رکھتا ہے اس کا مطالعہ ضروری ہے۔

مسلمانوں میں بہت کم ایسے ہیں جو اس کی اہمیت سے واقف ہیں اس لئے ضرورت تھی کہ اس کا ترجمہ کر کے مسلمانوں کے سامنے بھی پیش کیا جاتا۔ اس کی قیمت تین روپیہ ہے۔ اور ملنے کا پتہ ادارہ علمیہ۔ ۳۲۱ر اعظم پورہ۔ حیدرآباد دکن (جولائی ۱۹۵۰ء)

۳۔ آج کل دہلی

رینے گینا ؤں کا یہ قول کہ ویدانت نہ تو کوئی مذہب ہے نہ فلسفہ کم و بیش بھگوت گیتا پر صادق آتا ہے۔ اس کتاب میں عملی زندگی کے بعض اہم مسائل کے اخلاقی اور روحانی پہلوؤں پر روشنی

ڈالی گئی ہے۔ یہاں ہمیں زمانہ قدیم کا ایک خاص مدرسہ فکر نقطہ عروج پر دکھائی دیتا ہے۔ بھگوت گیتا کے اثرات اس قدر ہمہ گیر ہیں کہ اس وقت بھی اس کا شمار دنیا کی بڑی اہم کتابوں میں کیا جاتا ہے۔ اگرچہ بعض ایسی چیزیں بھی ہیں جن پر ایمان لائے بغیر انسان ایسے اسباق سے کماحقہ مستفید نہیں ہو سکتا۔ ایک تو مسلہ تناسخ ہے اور دوسرے اعمال اور اس کے نتائج مسلہ تناسخ کو بیشتر مذاہب تسلیم نہیں کرتے جبر و شر کو ہر مذہب تسلیم کرتا ہے اعمال کی سزا و جزا کو بھی سبھی مذاہب مانتے ہیں لیکن وہ ایک جنم کے اعمال کے مطابق نئے جنم میں سزا یا جزا کے قائل نہیں ہیں۔ بعض مغربی مفکر اس طرف متوجہ ہوئے ہیں۔ مثلاً مارس میز لنک نے اپنی کتاب ہاؤس پا نفس میں ہندوؤں کے نقطہ نظر سے کرم کے مسلہ کی بڑی فکر انگیز تاویل پیش کی ہے۔ بہر کیف بھگوت گیتا کی عظمت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ترجمہ جناب حسن الدین احمد کی محنت اور ہمت کا نتیجہ ہے۔ اردو کے جو تراجم نے جو میری نظر سے گزرے ہیں یہ ترجمہ ہر طرح سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ حسن الدین احمد صاحب نے بھگوت گیتا کو سادہ اور سلیس اردو میں منتقل کر کے اردو ادب کی قابل ستائش خدمت انجام دی ہے۔

کتابت و طباعت گوارا ہے۔ ضخامت ۱۴۲ صفحات۔ تین روپیہ قیمت کچھ زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ ملنے کا پتہ ادارہ علمیہ۔ ۲۱ سہر اعظم پورہ حیدر آباد

۴۔ تجلی دیوبند

یہ ہندو دھرم کی مشہور کتاب بھگوت گیتا کا اردو ترجمہ ہے۔ جو جناب حسن الدین احمد صاحب نے عمدہ کتابت و طباعت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ صفحات ۱۴۲۔ جلد معہ ڈسٹ کور دیگر دیوش ٹائٹل مانہ دیدہ زیب قیمت تین روپیہ ملنے کا پتہ ادارہ علمیہ اعظم پورہ۔ روبرو مدرسہ اعزہ حیدر آباد دکن۔

بھگوت گیتا کو ہندوؤں میں وہ درجہ تو حاصل نہیں جو قرآن کو مسلمانوں میں ہے۔ قرآن ہر مسلمان کے لئے حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے اور دوسری کوئی کتاب اس کی ہم رتبہ نہیں سمجھی جا سکتی۔ لیکن اہل ہنود میں گیتا کے علاوہ اور کئی مذہبی کتابیں بھی موجود ہیں جن میں یہ مذہبی عقیدت تقسیم ہو گئی ہے۔ بڑی حد تک غالباً یہ ہے کہ گیتا براہ راست سری کرشن کی پیش کش نہیں بلکہ ایک اہل کشف سنجے کی زبانی بیان ہے جو دھرشٹ راشٹر کو سنایا گیا ہے۔ گیتا کے فلسفیانہ تصوف پر یہاں نقد و نظر کی گنجائش نہیں۔ ترجمہ کے متعلق البتہ کہیں گے کہ بہت

سلیس۔ نہایت شگفتہ اور موضوع کی معنوی حیثیت اور کیفیت سے ہم آہنگ ہے۔ الفاظ کا مکمل مفہوم واضح کرنے کے لئے موزوں الفاظ چنے گئے ہیں۔ مذہبی اصطلاحات کو عمدگی سے اردو کے سانچہ میں ڈھالا گیا ہے اور جن الفاظ کا مکمل ترجمہ ممکن ہی نہ تھا ان کی توضیح اور تشریح کے لئے کتاب کے آخر میں تفصیلی فرہنگ لگائی گئی ہے۔ اس سے پڑھنے والا گیتا کے معانی و مطالب پر پوری واقفیت حاصل کر سکتا ہے اردو میں اس سے پہلے جو ترجمے گیتا کے کئے گئے وہ مکمل نہیں تھے۔ .... اس کا مطالعہ کافی مفید ہوگا۔

(مارچ ۱۹۵۰ء)

۵۔ نوائے ادب بمبئی

نغمہ الوہیت۔ از حسن الدین صاحب تقطیع ۸ × ۵، صفحات ۱۴۲، کاغذ معمولی۔ کتابت بہتر قیمت تین روپیہ۔ پتہ: عزیز باغ۔ سلطان پورہ۔ حیدر آباد دکن۔

بھگوت گیتا کا آسان اور عام فہم ترجمہ ہے۔ اس سے پہلے بھی گیتا کے مختلف تراجم ہو چکے ہیں۔ خاص طور سے مرزا جعفر علی خاں اثر کا نغمہ جاوید کے نام سے منظوم ترجمہ اہمیت رکھتا ہے۔ حسن الدین احمد صاحب کا یہ ترجمہ کامیاب ہے شروع میں پنڈت سندر لال کا ایک مقدمہ ہے جس میں انھوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ ملک کے مختلف مذاہب کے ماننے والوں کو ایک دوسرے کے مذہب سے واقفیت ضروری ہے۔ مترجم نے پوری کوشش اور محنت سے ترجمہ شگفتہ کیا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ اس مقدس کتاب سے سنسکرت نہ جاننے والے بھی مستفید ہو سکیں۔ قیمت اگر قدرے کم ہوتی تو اچھا تھا۔ (اکتوبر ۱۹۵۴ء)

۲۔ فطری علاج

ا۔ معارف

بیماریوں کے فطری علاج کا طریقہ بہت پرانا ہے۔ طب جدید کی ترقیوں نے اس کو بھلا دیا تھا مگر جب سے یورپ کے بعض ماہرین نے اس کی جانب توجہ کی اور بحیثیت فن اس کو مدون کر کے اس پر کتابیں لکھیں اس وقت سے پھر اس کی جانب توجہ ہونے لگی ہے۔ اردو میں اس موضوع پر بہت کم معلومات ہیں اس لئے مصنف نے فطری طریقہ علاج پر یہ کتاب لکھی ہے۔ اس میں علمی و عملی دونوں پہلوؤں سے تفصیل کے ساتھ اس کے اصول اور طریقوں پر روشنی ڈالی گئی ہے جن لوگوں کو اس طریقہ علاج سے دلچسپی ہو انھیں

اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیئے ۔ (اکتوبر ۱۹۵۲ء)

۲۔ صدق جدید

فطری علاج پر جسے عرف عام میں قدرتی علاج کیا جاتا ہے اردو میں اس سے قبل بھی کتابیں جن میں بعض خاصی ضخیم ہیں لکھی جا چکی ہیں۔ یہ رسالہ اس طریق علاج کے ضروری اور جامع تعارف کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں فطری علاج کے اصول و کلیات خاص اصطلاحات۔ طریق علاج شفا کے قدرتی طریقوں کے بیان کے ساتھ ساتھ اس طریقہ علاج کا موازنہ دوسرے رائج الوقت طریق علاج سے کیا گیا ہے۔ اس کی فوقیت ثابت کی گئی ہے۔ .... فطری علاج کے خاص علمبردار دوں لوئی کوہنی پریس نتز وغیرہ کی تصویریں بھی اس میں شامل ہیں۔ (۳۰/ اپریل ۱۹۵۴ء)

۳۔ اردو

حسن الدین احمد صاحب کی یہ تصنیف بلاشبہ اردو میں ایک اچھی کتاب کا اضافہ ہے۔ اپنی اس کتاب میں انھوں نے فطری علاج کے مشرقی اور مغربی ماہروں کی کتابوں کے اقتباسات اور ان کے سالہا سال کے تجربوں کی روشنی میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ فطری علاج بھی الوپیتھک علاج کی طرح سائنٹفک ہے .... ایک دلچسپ موضوع پر ایک اچھی کتاب لکھ کر حسن الدین صاحب نے بلاشبہ اردو کی خدمت کی ہے۔ (۲۸/ ستمبر ۱۹۵۳ء)

۴۔ سیاست

جناب حسن الدین احمد صاحب۔ جامعہ عثمانیہ کے قابل گریجویٹس میں سے ایک ہیں۔ موصوف نے فطری علاج کے عنوان پر ایک دلچسپ اور مفید کتاب مرتب اور شائع کی ہے۔ مصنف نے ابتدا ہی میں یہ واضح کر دیا ہے کہ فطری علاج کے طریقوں کو علمی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ انگریزی اور دیگر زبانوں میں تقریباً ہر موضوع پر سینکڑوں کتابیں موجود ہیں۔ اردو میں فطری علاج کے موضوع پر کوئی اچھی اور جامع کتاب اب تک نظر سے نہیں گزری حسن الدین احمد صاحب نے بڑی محنت سے "فطری علاج" شائع کی ہے۔ طبی علاج اور فطری علاج کے فرق اور شفا کے فطری طریقوں پر دلچسپ انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ اس دور میں

جب کہ سائنس اور طب نے حیرت انگیز ترقی کی ہے فطری علاج کو کوئی اہمیت حاصل نہیں رہی۔ لیکن فطری علاج بھی ایک علم ہے اور حکماء نے اس کی افادیت کا اعتراف کیا ہے۔ مصنف نے آسان زبان میں اس طریق علاج کے ہر پہلو کو واضح کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ایسے زمانہ میں جب کہ اردو ایک نازک دور سے گزر رہی ہے اس زبان میں ایک فنی کتاب کا اضافہ اس زبان کے ارتقاء میں مفید ثابت ہوگا۔ فاضل مصنف اس کوشش پر لائق مبارکباد ہیں۔ مصنف نے کتاب کے آخر میں ان کتابوں کا حوالہ بھی دیا ہے جن سے اس کتاب کی ترتیب میں مدد لی گئی ہے۔ یہ انڈکس اس طریق علاج میں دلچسپی رکھنے والوں کے لئے بڑی مدد دے گا۔ (۱۱ر نومبر ۱۹۵۲ء)

۵۔ رسالہ راز ہفتہ وار

..... اردو زبان میں یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ اور ہر سمجھ دار شخص کو دعوت کر دیتی ہے۔ حسن الدین صاحب نے اس کے ذریعہ اردو ادب کی قابل ستائش خدمت انجام دی ہے.....

.... (۱۱ر ستمبر ۱۹۵۳ء)

۶۔ ہندوستانی ادب

..... فطری علاج کے مفید یا غیر مفید ہونے کے الجھاؤ میں پڑے بغیر ہم یہ ضرور کہیں گے کہ اس چھوٹی سی کتاب میں "فطری علاج" اور اسکے عملی پہلوؤں پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔ شاید یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مولف کتاب نے دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے۔ اس لحاظ سے ہم فطری علاج کے شیدائیوں سے خصوصاً اور عوام سے عموماً اس بات کی پر زور سفارش کریں گے کہ اس کتاب کا ایک بار ضرور مطالعہ کریں...

(اگست ۱۹۵۳ء)

۷۔ ملاپ

..... اس مفید کتاب میں فطری علاج سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے ایک راستہ دکھایا گیا ہے۔ اور اس فن پر لکھی گئی اردو اور انگریزی کتابوں کی ایک طویل فہرست بھی حوالہ کے لئے اس میں شامل ہے۔ مصنف نے بڑی محنت و کاوش سے اس طریقہ علاج کے بانیوں اور استادوں کی دس

عکسی تصویریں بھی شائع کی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بہرحال یہ کتاب اس موضوع پر ہر لحاظ سے ایک مفید کتاب ہے ۔ اور ہم مصنف کو ان کی کامیاب کاوش پر مبارکباد پیش کرتے ہیں ۔ (۷ر ستمبر ۱۹۵۲ء)

۳۔ اردو الفاظ

۱۔ ہماری زبان

اگر ہم چاہتے ہیں کہ اردو کا شمار دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں میں ہو تو ہمیں کچھ عرصے کے لئے میر اور غالب کا پیچھا چھوڑ کر ایسے علوم کی طرف متوجہ ہونا ہوگا جس سے اردو کا دامن خالی ہے ۔ پوری اردو دنیا کو حسن الدین احمد صاحب کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ انھوں نے اتنے اہم موضوع پر قلم اٹھایا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ظاہر ہے کہ یہ کام بڑی دیدہ ریزی اور جانفشانی کا طالب ہے اور اتنے بڑے کام کے لئے کم سے کم دس بارہ سکالرز پر مشتمل ایک ٹیم کی ضرورت تھی حیرت ہے کہ حسن الدین احمد صاحب نے بغیر کسی مالی امداد کے تن تنہا اتنا بڑا کام کیسے کر دیا جب کہ سرکاری مصروفیات ان کی زندگی کو گھن کی طرح لگی ہوئی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کتاب بہت خوبصورت اور دیدہ زیب چھپی ہے ۔ (۸ر جولائی ۱۹۷۴ء)

۲۔ برہان

یہ اردو کی وہ خوش نصیب کتاب ہے جس کا اجراء وزیر اعظم نے اپنے ہاتھ پر ایک شاندار تقریب میں کیا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ظاہر ہے کہ یہ کام بڑی محنت اور عرق ریزی کا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لائق مرتب جو مرکزی حکومت میں ایک اعلیٰ افسر ہیں ان کا یہ ذوق بہت زیادہ قابل قدر اور لائق تحسین ہے کہ اپنے منصب کی سرکاری مصروفیتوں کے باوجود گیارہ برس کی محنت شاقہ کے بعد انھوں نے اردو زبان کے دس ہزار نو سو ستائیس الفاظ کی تکرار متعین کی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ بغرض کہ کتاب اردو لٹریچر میں اپنی نوعیت میں منفرد ہے ۔ امید کہ اہل ذوق اس کی قدر کریں گے ۔ (مئی ۱۹۷۴ء)

۳۔ تحریک

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جناب حسن الدین احمد نے اردو الفاظ کے فروغ اور مطالعہ میں جس دانشمندانہ رویے سے دلچسپی لی ہے اس کے لئے ان کا ممنون ہونا چاہئے ۔ اردو الفاظ شماری بہ وجوہ اہم اور بڑا کام ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

(اگست ۱۹۷۴ء)

۴۔ رہنمائے دکن

...... یہ کتاب جو ایک عظیم پروجکٹ کا نتیجہ ہے اردو زبان میں اپنی نوعیت کی واحد چیز ہے یہ کام جس کو حسن الدین احمد نے انجام دیا ہے اداروں کے کرنے کا کام ہے ۔ اس ضخیم جلد کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ کس طرح ایک شخص نے تنہا اس بڑے کام کو بغیر کسی مالی امداد کے ۱۴ سال تک مسلسل مصروف رہ کر انجام دیا ... اس کتاب میں معلومات کا ایسا بیش بہا خزانہ ہے جس کی بنیاد پر کئی ایک تحقیقاتی کام انجام دیئے جاسکتے ہیں ۔ مثلاً اردو کی موجودہ نصابی کتب کی تیاری میں جن الفاظ کو استعمال کیا جاتا ہے اگر ان کی تکرار معلوم کی جائے تو یہ بات واضح ہوگی کہ غیر مانوس اور زبان میں کم استعمال ہونے والے الفاظ بھی ان میں استعمال کئے گئے ہیں ۔ ... گرد پوش دیدہ زیب ہے اردو دنیا کو جناب حسن الدین احمد کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ انھوں نے زبان کی ایک بنیادی خدمت انجام دی ہے ۔ (۱۷ ستمبر ۱۹۷۳ء)

۵۔ سب ساتھ

ابھی حال میں اردو الفاظ شماری کے نام سے ایک ضخیم اور موضوع کے لحاظ سے بالکل اچھوتی کتاب شائع ہوئی ہے جس کی رسم افتتاح وزیر اعظم اندرا گاندھی کے ہاتھوں سے انجام پائی اس مختصر اور مخصوص تقریب میں وزیر اعظم کے علاوہ جناب شفیع قریشی ۔ جناب یعقوب محسن ۔ جناب اندر کمار گجرال اور دیگر معززین موجود تھے ۔ گورنر علی یاور جنگ نے اپنے پیغام میں کہا "میں حسن الدین احمد سے ان کے بچپن سے واقف ہوں اور ان کے کارناموں اور دلچسپی سے دیکھتا رہا ہوں انھوں نے سرکاری فرائض کے علاوہ اردو زبان کے مطالعہ اور فروغ کے سلسلہ میں دانشمندانہ دلچسپی لی ہے ۔ ان کا حالیہ کارنامہ اردو الفاظ شماری بہ سبب وجوہ اختراعی اور عظیم کارنامہ ہے مجھے مسرت ہے کہ وزیر اعظم اس کی رسم اجراء انجام دے کر ان کی عزت افزائی کر رہی ہیں مجھے امید ہے کہ یہ ہمت افزائی ان کو اپنے تحقیقاتی کاموں اور علمی سرگرمیوں کو جاری رکھنے میں معاون ثابت ہوگی ۔

گورنر اکبر علی خاں نے اپنے پیغام میں کہا "میں سمجھتا ہوں کہ آپ نے اس کی تیاری میں بڑی عرق ریزی سے کام لیا ہے اور اپنے جد امجد شمس العلماء نواب عزیز جنگ ولا کی اعلیٰ علمی روایات کو برقرار رکھا ہے ۔ جو ایک جید عالم تھے اور اپنے علمی انہماک کی وجہ سے ہر حلقہ میں عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے ۔ قوانین مالگزاری کی تدوین ان کا ایک بڑا کارنامہ ہے" ......

الفاظ شماری پر دوسری زبانوں میں کافی کام ہوا ہے مگر اردو زبان میں یہ کام بالکل نیا ہے ۔۔۔۔ حسن الدین احمد نے پہلی مرتبہ سائنٹفک طریقوں سے اردو کے تمام مروجہ اصناف سخن کے مطالعہ اور تحقیق کے بعد معلوم کیا ہے کہ کونسا لفظ زیادہ استعمال میں آتا ہے اور کونسا کم ۔ ۔ ۔ حسن الدین احمد کی اردو الفاظ شماری یقیناً ایک مفید اور دلچسپ کتاب ہے ۔ (۱۳ر اکتوبر ۱۹۷۳ء)

۶۔ سحر

۔۔۔۔۔ اردو دنیا کو جناب حسن الدین احمد صاحب کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ انھوں نے زبان کی ایک بنیادی خدمت انجام دے کر تاریخ اردو زبان میں اپنا ایک خصوصی مقام پیدا کرلیا ہے ۔

(یکم نومبر ۱۹۷۳ء)

۷۔ شاہکار

آج کل ہندوستان میں اردو کتب کی اشاعت کے لئے تقریباً ہر مقام پر ادارہ جات کا قیام عمل میں آرہا ہے لیکن افسوس کی بات ہے کہ بیشتر ادارہ جات سے صرف جاسوسی ناول جنسی ناول و افسانوں کے مجموعے ہی شائع ہو رہے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض ایسے ادارہ جات بھی قائم ہیں جو اردو کی ٹھوس خدمت انجام دے رہے ہیں ۔ ایسے ہی ادارہ جات میں حیدرآباد کی ولا اکیڈمی کا شمار ہے اس ادارہ سے ابھی حال ہی میں اردو الفاظ شماری کی اشاعت عمل میں آئی ہے جس کو صدر ادارہ مولوی حسن الدین احمد صاحب ہی نے مرتب کیا ہے الفاظ شماری فنی و بنیادی اہمیت کا کام ہے ۔ انگریزی اور دوسری زبانوں میں تو یہ کام ہوا ہے لیکن اردو میں ایسا مکمل کوئی کام آج تک نہ ہو سکا تھا ۔ اس کام کی اہمیت کا اندازہ صرف اس بات سے ہو سکتا ہے کہ یہ کام ۱۹۵۹ء میں شروع ہو کر ۱۹۷۳ء میں تکمیل پایا ہے ۔ (۱۶ر نومبر ۱۹۷۳ء)

۸۔ سیاست

گذشتہ دو سال کے قلیل عرصہ میں ولا اکیڈمی حیدرآباد نے ۲۵ دلچسپ اور مفید مطبوعات شائع کی ہیں لیکن زیر نظر کتاب اردو الفاظ شماری نہ صرف ولا اکیڈمی کی مطبوعات میں خاص امتیاز رکھتی ہے بلکہ اردو میں بھی اس کا اپنا مقام اور اس کی فنی اہمیت ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ حسن الدین احمد نے ایسا بیش قیمت ذخیرہ اعداد فراہم کیا ہے جو پہلی بار منظر عام پر آیا ہے اس کے بعد تحقیقات کی نئی راہیں کھلی ہیں ۔ ۔ ۔ الملاد

وشماری کی حد تک کافی اہتمام کیا گیا ہے جس کی وجہ سے غلطیاں کم نہ ہونے کے برابر ہیں پیش لفظ میں الفاظ شماری اور اس کے طریقۂ کار اور سابقہ کوششوں پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے ۔ (۱۷ ستمبر ۱۹۷۳ء)

۹۔ بکس انڈیا (انگریزی) میں تبصرہ کرتے ہوئے ملک کے مایۂ ناز ماہر لسانیات ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے یہ توقع ظاہر کی ہے کہ یہ کام لسانی تحقیقات اور زبان دانی کی نصابی کتب کی تیاری کے سلسلہ میں روشن امکانات پیدا کرے گا ۔

۱۰۔ لنک (انگریزی)

ایک آئی اے ایس آفیسر حسن الدین احمد نے بحیثیت زبان اختیاری اردو تعلیم کو بڑھاوا دیا ہے۔ اپنی عہد آفریں کتاب "اردو الفاظ شماری" میں انھوں نے یہ ظاہر کیا ہے کہ کس طرح زبان سیکھنے کی مدت کو تین سال سے کم کر کے چھ ماہ کیا جا سکتا ہے ۔...... زیر نظر کتاب "الفاظ شماری" پر پہلی سائنٹیفک کتاب ہے ۔ جو کسی بھی ہندوستانی زبان میں لکھی گئی ۔ (۲۳ ستمبر ۱۹۷۳ء)

۱۱۔ روزنامہ ہندو مدراس (انگریزی) نے اپنے شمارہ مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۹۷۳ء میں اس کتاب پر اداریہ لکھتے ہوئے یہ تجویز پیش کی ہے ۔ کہ جنوبی ہند کی زبانوں میں اس نوعیت کا کام کیا جائے ۔ کہ ان کی لسانی یکسانیت کو ثابت کرنے کی کوشش کی جائے ۔ تو نہ صرف علمیت کی نئی راہیں کھلیں گی ۔ بلکہ یہ ایک عظیم کام ہوگا۔

۱۲۔ اخبار ہندو مدراس مورخہ ۱۲ جنوری ۱۹۷۴ء میں "عظیم الشان کام" کے عنوان کے تحت تبصرہ کرتے ہوئے یہ توقع ظاہر کی گئی ہے ۔ کہ اردو علماء اور طالب علم اس کتاب کو قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے ۔ اس میں الفاظ شماری کو یک فاضلانہ اور باضابطہ کام قرار دیا گیا ہے ۔

۱۳۔ عصری ادب

..... عنوان "الفاظ تاریخ کی درین ہیں" کے تحت کافی دلچسپ باتیں کہی گئی ہیں جن سے مصنف کی وسعت نظر اور بھرپور تلاش کا پتہ چلتا ہے ۔ ..... بلاشبہ مصنف نے بڑی محنت ۔ لگن اور فراست سے اپنے کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا ہے جسے سراہے بنا رہنا ممکن نہیں ہے ۔ زیر نظر کتاب ایک کارنامہ ہے جو اردو والوں کے لئے قابل قبول بھی ہونا چاہئے اور قابل ستائش بھی ۔ اس کتاب کی اہمیت اس

لئے بھی بڑھ جاتی ہے کہ یہ نہ صرف اردو بلکہ ہندوستان بھر کی زبانوں میں اپنی نوعیت کا پہلا بڑا کام ہے۔ اسے اردو میں ایک اضافہ کے طور پر تسلیم نہ کرنا کفر ہے۔ اردو کے دوسرے بڑے علمی کاموں میں بہتوں سے اس کا قد بلند ہے۔ . . . . . اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ نصف درجن ہاتھوں کے کام کو صاحب کتاب نے صرف دو ہاتھوں سے نپٹایا ہے . . . . اس کتاب کی قدر واجب ہے۔